اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مارچ ۲۰۲۴ء

مُدِیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اشاعتِ ’تدریس القرآن‘ میں تعاون فرمائیں

جلد اوّل، صفحات ۵۰۰

ہم ڈاکٹر محمد امین صاحب کی مرتبہ کتاب ’تدریس القرآن‘ جو آسان انداز میں قرآن حکیم کا ترجمہ کرنا سکھاتی ہے اور تجربہ یہ ہے کہ صرف ایک پارہ اس طرح پڑھنے سے باقی قرآن حکیم کا تقریباً ۸۰ فیصد سمجھنے میں آنے لگتا ہے۔

اس میں حرفی/لفظی ترجمہ ہے، بامحاورہ ترجمہ بھی ہے۔ قرآنی الفاظ کے اُردو استعمالات بھی دیے گئے ہیں۔ مشکل الفاظ کے معانی ہیں، مفہوم کا خلاصہ ہے اور حاصل کردہ سبق ہے۔ طلبہ اور بچوں کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ حروفِ جارہ اور ضمائر سرخ رنگ میں دیے گئے ہیں جبکہ افعال اور اسماء کا مادہ نیلے رنگ میں دیا گیا ہے۔

ہم اس ماہ رمضان میں اس کی پہلی جلد (سورۃ الفاتحہ تا النساء) طبع کروا رہے ہیں۔ جو اصحاب قرآنِ حکیم کی طباعت کی اس خدمت میں ہمارے ساتھ مالی تعاون کرنا چاہیں وہ رابطہ فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو قرآنِ حکیم پڑھنے، سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

برائے تفصیلات: حافظ محمد عمران طحاوی 0300-4107282

تحریکِ رجوع الی القرآن

مکان نمبر 178، گلی نمبر 2، نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ermpak@hotmail.com

تدریس القرآن

سبق : ۲

قرآن حکیم کا ترجمہ سیکھنے کے لیے

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

اٰیَاتُهَا ۲۸۶ — رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

(آیت: ۱-۵) متن قرآن حکیم مع ترجمہ							قرآنی لفظ	اردو استعمال
الٓمّٓ (1)	ذٰلِكَ	الْكِتٰبُ	لَا	رَيْبَ ۛ	فِيْهِ ۛ	هُدًى	الْكِتٰبُ	کتاب، کاتب، کتابت
الم	یہ	کتاب	نہیں	شک	میں اس	ہدایت	هُدًى	ہدایت، ہادی، مہدی
الم۔ یہ (وہ) کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے								
لِّلْمُتَّقِيْنَ (2)	الَّذِيْنَ	يُؤْمِنُوْنَ	بِالْغَيْبِ	وَيُقِيْمُوْنَ			لِّلْمُتَّقِيْنَ	تقویٰ، متقی، متقین
لیے متقیوں کے	جو	وہ ایمان لاتے ہیں	پر غیب	اور وہ قائم کرتے ہیں			يُؤْمِنُوْنَ	ایمان، مومن، مومنین
متقیوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں غیب پر اور نماز							الْغَيْبِ	غیب، غائب، غیاب
الصَّلٰوةَ	وَمِمَّا	رَزَقْنٰهُمْ	يُنْفِقُوْنَ (3)	وَالَّذِيْنَ			رَزَقْنٰهُمْ	رزق، رازق، رزّاق
نماز	اور سے جو	رزق ہم نے دیا ہے ان کو	وہ خرچ کرتے ہیں	اور جو			يُنْفِقُوْنَ	نان و نفقہ، انفاق فی سبیل اللہ
قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو								
يُؤْمِنُوْنَ	بِمَآ	اُنْزِلَ	اِلَيْكَ	وَمَآ	اُنْزِلَ	مِنْ	يُؤْمِنُوْنَ	ایمان، مومن، مومنین
وہ ایمان لاتے ہیں	پر جو	نازل گیا	طرف تمہاری	اور جو	نازل گیا	سے	اُنْزِلَ	نزلہ زکام، منزل، نزول، نازل
ایمان لاتے ہیں اس (کتاب) پر جو تمہاری طرف اتاری گئی اور جو تجھ سے								
قَبْلِكَ	وَبِالْاٰخِرَةِ	هُمْ	يُوْقِنُوْنَ (4)	اُولٰٓئِكَ	عَلٰى		قَبْلِكَ	قبل از طعام، نماز سے قبل
پہلے تم	اور پر آخرت	وہ	یقین رکھتے ہیں	یہ لوگ	پر		بِالْاٰخِرَةِ	آخرت، آخری
پہلے اتاری گئیں اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ان کے								
هُدًى	مِّنْ	رَّبِّهِمْ	وَاُولٰٓئِكَ	هُمُ	الْمُفْلِحُوْنَ (5)		هُدًى	ہدایت، ہادی، مہدی
ہدایت	سے	رب ان کے	اور یہ لوگ	وہ	کامیاب۔		الْمُفْلِحُوْنَ	فلاح و بہبود، فلاحی ریاست
رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔								

بقیہ آخری صفحہ پر

اہم نکات

مشکل الفاظ کے معانی

١۔ جوڑ کر لکھے گئے الفاظ: لِلْمُتَّقِیْنَ: لِ+ اَلْ+ مُتَّقِیْنَ مِمَّا: مِنْ+ مَا فِیْهِ: فِیْ+ هٖ
رَزَقْنٰهُمْ: رَزَقَ+ نَا+ هُمْ اِلَیْكَ: اِلٰی+ كَ بِالْاٰخِرَةِ: بِ+ اَلْ+ اٰخِرَةِ

٢۔ عربی میں بھی بعض دوسری زبانوں کی طرح ایسے الفاظ ہوتے ہیں جو متعدد وجوہ کی بنا پر بظاہر حروف کا بامعنی مجموعہ نہیں ہوتے مثلاً ہم نادرا، پیمرا، نیب وغیرہ کے الفاظ عام استعمال کرتے ہیں لیکن یہ بامعنی الفاظ نہیں ہیں بلکہ اصل کا مخفف ہیں۔ الٓمّٓ بھی قرآن حکیم کے ایسے ہی الفاظ میں سے ہے۔ ان کو ''حروفِ مقطعات'' کہتے ہیں۔

مفہوم کا خلاصہ

١۔ سورۃ الفاتحہ میں ہم نے اللہ سے ہدایت کی جو دعا مانگی تھی، گویا اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرما کر ہمارے لیے قرآن حکیم نازل کیا جو ہمیں یقینی اور حتمی ہدایت سے نوازتا ہے۔

٢۔ قرآن حکیم میں شک نہ ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے کتاب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں اور دوسرے یہ کہ قرآن حکیم میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ حتمی اور یقینی طور پر صحیح ہیں اور ان میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

٣۔ قرآن حکیم میں متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

☆ غیب پر ایمان لانا یعنی ان حقائق پر جو بظاہر نظر نہیں آتے۔ انہیں بن دیکھے ماننا جیسے اللہ تعالیٰ، فرشتے، جنت، دوزخ وغیرہ

☆ اللہ کی نازل کردہ کتابوں کو ماننا

☆ آخرت کے دن پر یقین رکھنا

☆ نماز قائم کرنا

☆ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

حاصل کردہ سبق

١۔ قرآن حکیم کی ہدایت کو حتمی سمجھو اور اس کے خلاف کسی چیز کو قبول نہ کرو۔

٢۔ ہدایت اور کامیابی کی جو پانچ صفات اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بیان کی ہیں ان کو اپناؤ، جو یہ ہیں: غیب پر ایمان لانا، اللہ کی نازل کردہ کتابوں اور آخرت پر یقین رکھنا، نماز پڑھنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

ماہنامہ
البرہان
لاہور
Since 2010
جلد ۲۸ شمارہ ۳
برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhaan.pk
مارچ ۲۰۲۴ء/شعبان/رمضان المبارک ۱۴۴۵ھ

آئینہ مضامین

☜ فکرونظر
استیبلشمنٹ، حکمرانوں اور سیاستدانوں کی توجہ کے لیے ۵
☜ تعلیم وتربیت/تزکیہ
-تسہیل القرآن مدیر ۷
-قرآن حکیم میں اللہ تعالی کی صفاتِ علم (آخری قسط) ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی ۹
-بچوں کو کہانیاں کیسے سنائی جائیں؟ ادارہ ۲۰
-بچوں کی تربیت کا ایک غلط منہج امیر حمزہ ۲۴
-رمضان کے لیے پلاننگ کیجیے مدیر ۲۶
-اپنی تنہائی بہتر بنائیے ڈاکٹر محمد زبیر ۲۷
-اللہ سے گلہ شکوہ ڈاکٹر طفیل ہاشمی ۲۹
☜ تفہیم دین
-مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی مراد علی ۳۰
-مفتی تقی عثمانی صاحب کا خط: عمار ناصر کے نام مولانا مفتی تقی عثمانی ۳۱
☜ اسلام اور پاکستان/انتخابات ۲۰۲۴ء
- دینی سیاسی جماعتوں کو ووٹ کیوں نہیں ملتے؟ پروفیسر ڈاکٹر محمد امین ۳۴
- دینی سیاسی جماعتوں کے لیے متبادل پروگرام: مزید وضاحت ۴۱
- جماعتِ اسلامی کے اہلِ علم و دانش کی خدمت میں ۴۳
☜ مطالعۂ کتاب
'حقیقت جمہوریت' از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری مکرم محمود ۴۸
English Section ۶۷
Understanding Contemporary Capitalist Order
Dr. Javed Akbar Ansari
☜ مقالۂ خصوصی
پاکستان میں مذہبی سیاست اور اسلامی تحریکیں سید خالد جامعی ۶۸

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0300-4107282)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِاعانت: فی شمارہ 85 روپے
سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے
تاحیات 20,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

رمضان المبارک قرآن حکیم کی معیت میں گزاریئے

تحریک اصلاحِ تعلیم کے طبع کردہ دو قرآنی سلسلے بلا معاوضہ حاصل کیجیے اور رمضان المبارک قرآن حکیم کے ساتھ گزاریے:

* تدریس القرآن مع ورک بک (پہلا پارہ): ترجمۂ قرآن سیکھنے کے لیے
* تسہیل القرآن/ پنج سورہ (آخری پارہ مع یٰسین، رحمٰن، واقعہ، ملک) فہم قرآن کے لیے

خود آکر بلا معاوضہ حاصل کریں۔ اگر ڈاک کے ذریعے منگوانا ہو تو ایک سو روپیہ ڈاک خرچ بذریعہ جاز کیش بھجوائیں۔ حافظ محمد عمران طحاوی: **0300-4107282**

مکان نمبر 178، گلی نمبر 2، نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ضرورت والنٹیئرز/ رضا کاران

اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے بھائی جو اللہ کی رضا کے لیے قرآن کریم کی خدمت کرنا چاہتے ہوں اور اس کی تعلیمات کو عوام میں پھیلانا چاہتے ہیں وہ اس کام کو فی سبیل اللہ کرنے کے لیے رجوع فرمائیں۔ ہمارے پیش نظر بھی صرف خدمتِ قرآن ہے دنیاوی منافع نہیں۔

آپ سکولوں سے رابطہ کریں کہ وہ اپنے بچوں کو کلاس میں ترجمۂ قرآن سکھائیں۔ ہماری کتاب 'تدریس القرآن' بالکل آسان انداز میں طلبہ و طالبات کو، بغیر گرامر اور رٹے کے، قرآن حکیم کا ترجمہ کرنا سکھا دیتی ہے۔ صرف ایک پارہ پڑھ لینے سے سارے قرآن کا تقریباً ۸۰ فیصد سمجھ میں آنے لگتا۔ پہلا پارہ سکولوں کو صرف لاگت پر مہیا کیا جائے گا۔

برائے تفصیلات: حافظ محمد عمران طحاوی: **0300-4107282**

تحریکِ رجوع الی القرآن

مکان نمبر 178، گلی نمبر 2، نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

ermpak@hotmail.com

فکر و نظر

اسٹیبلشمنٹ، حکمرانوں اور سیاستدانوں کی توجہ کے لیے

ملکی معیشت کا واحد حل جس پر غور کرنے کے لیے وہ تیار نہیں
حالانکہ یہ پاکستانیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے

ہم کئی دفعہ کہہ اور لکھ چکے، کوئی نہیں سنتا، کوئی غور نہیں کرتا، اس کے باوجود کہ ہمارے عوام کی بہت بڑی اکثریت یعنی اعلیٰ متوسط طبقہ پس رہا ہے، متوسط طبقہ سسک رہا ہے اور غریب مر رہا ہے۔ ہماری ڈوبتی معیشت کا حل یہ ہے کہ:

* بیرونی قرض خواہوں سے معذرت کر لی جائے کہ ہم اگلے دس سال تک آپ کو قرض واپس نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد قسطوں میں اصل زر واپس کریں گے۔

ہم فوجی اور سیاسی حکمرانوں سے کہتے ہیں کہ یہ صرف اعصاب کی جنگ ہے۔ اس پر یورپ وامریکہ اور ان کے حلیف پاکستان پر حملہ نہیں کریں گے۔ ناراضگی دکھا سکتے ہیں، دھمکیاں دے سکتے ہیں لیکن اگر آپ ڈٹ جائیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اپنی سیاسی، جغرافیائی اور تزویراتی اہمیت کا اندازہ کریں اور سٹینڈ لیں۔ کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ صرف اعصاب کی جنگ ہے، ہمت کریں، حوصلہ کریں اور ڈٹ جائیں۔ ارجنٹینا، بولیویا، اکواڈور، بولیویا، یونان، مصر اور دوسرے کئی مما لک پلاننگ سے ڈیفالٹ کر چکے ہیں لیکن کسی قرض خواہ نے ان پر حملہ نہیں کیا۔ ہمیں ۹۹ فیصد یقین ہے کہ کوئی قرض خواہ پاکستان پر حملہ نہیں کرے گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ ڈرنا چھوڑ دیں اور ڈٹ جائیں۔ اور فرض کریں کہ کوئی حملہ کر دے گا تو کیا ہم چوڑیاں پہنے بیٹھے ہیں؟ دنیا کی پانچویں بڑی فوج کیا ہم نے بزنس کرنے اور انہیں پلاٹ اور زمینیں الاٹ کرنے کے لیے رکھی ہوئی ہے؟

اس کے ساتھ ہی اگر آپ دو قدم اور اٹھائیں یعنی

* ملک میں گیس اور پٹرول کے ذخائر اور قیمتی دھاتوں کے ذخائر موجود ہیں لیکن

نامعلوم بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے ان کو نکالا نہیں جاتا۔ ان کو نکال کر استعمال میں لایا جائے۔

* ارکانِ اسمبلی وسینٹ، حکمرانوں، ججوں، سول اور فوجی افسروں کو دی جانے والی ہوش ربا مراعات ختم کردی جائیں۔

اگر آپ یہ کرلیں تو پاکستان کے عوام دو تین سال کے اندر مہنگائی اور افراطِ زر کے پنجے سے نکل جائیں گے اور ہمیں سو فیصد یقین ہے کہ دس سال بعد پاکستان ایک امیر ملک ہوگا، ان شاءاللہ۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ فوجیو، سیاستدانو، حکمرانو! ہمت کرو، عقل کرو۔ عوام کو ذلت وخواری کی زندگی سے نکالو۔ جو یہ کام کرے گا عوام اس کے ہاتھ چومیں گے، اسے سر پہ بٹھائیں گے اور اس کے اقتدار کے دوام کی آرزو کریں گے۔

اے اہلِ غزہ!
ہم شرمندہ ہیں

* کہ پاکستان کی حکومت اور اسٹیبلشمنٹ نے آپ کی وہ مدد نہیں کی جس کے آپ مستحق تھے اور جس کی آپ کو ضرورت تھی، اس کے باوجود کہ وہ اس پر قادر تھے۔

* ہم اہل پاکستان نے آپ کی اتنی مالی مدد نہیں کی جتنی کرنی چاہیے تھی اور اسرائیلی امریکی فرموں کا اتنا بائیکاٹ نہیں کیا جتنا کرنا چاہیے تھا کیونکہ ہماری دینی جماعتوں نے مل کر اور متحد ہوکر اس کے لیے تحریک نہیں چلائی۔

* البتہ ہم اہل پاکستان آپ کے لیے دعا ضرور کرتے رہے ہیں اور اب بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کم کرے، آپ کو حوصلہ دے اور آپ کو فتح عطا فرمائے۔

(آمین)

مرتب: ڈاکٹر محمد امین

تسہیل القرآن
فہم قرآن کے لیے

* قرآن کریم کی عربی عبارت کا مفہوم اُردو زبان میں
* جمہور مفسرین کی راہ سے نکلے بغیر
* زائد الفاظ نسخ میں دیے گئے ہیں

سورۃ الفاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○	شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ	ساری تعریفیں اور شکر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو:
رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ	* جو سب جہانوں کو پالنے والا ہے
الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ	* جو مہربان اور رحم کرنے والا ہے
مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ	* جو اس دنیا ہی کا نہیں آخرت کے دن کا بھی مالک ہے
اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ	اے اللہ جی! ہمیں توفیق دیجیے کہ ہم آپ ہی کی عبادت کریں اور آپ ہی سے مدد چاہیں
اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ	سیدھے راستے کی طرف ہماری رہنمائی فرمایئے
صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ	* ان لوگوں کے راستے کی طرف جن پر آپ نے انعام کیا
غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ	* ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر آپ کا غضب ہوا
وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ٪	* اور نہ اُن کا جو گمراہ ہو گئے۔

سورۃ البقرہ
مومنین کی صفات

الٓـمّٓ ۚ	ال م
ذٰلِكَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۛۚ فِیۡہِ ۚۛ	یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وہ کتاب ہے جس کے مضامین میں کوئی شک نہیں
ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ	یہ ہدایت ہے ان متقین کے لیے جو:

الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ	۱۔اللہ پر ایمان لاتے ہیں،بغیر اسے دیکھے
وَيُـقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ	۲۔جونماز قائم کرتے ہیں
وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ۙ	۳۔جواس رزق میں سے خرچ کرتے ہیں جوہم نے انہیں دیاہے
وَالَّذِيۡنَ	اور یہ وہ لوگ ہیں:
يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ	۴۔جو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں جو ہم نے تم پر نازل کیا ہے
وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ	۵۔اوران کتابوں پر بھي جوہم نےتم سے پہلے انبیاء پر نازل کی تھیں
وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ؕ	۶۔اورجوآخرت پر یقین رکھتے ہیں
اُولٰٓـئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ رَّبِّهِمۡ ۗ	یہی لوگ اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں
وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۞	اوریہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

مومنین کی صفات کے بعد کفار کا ذکر

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۞	جن لوگوں نے کفرکو اپنانے کا فیصلہ کرلیا ہے،ان کے لیے برابر ہے کہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، وہ ایمان لانے والے نہیں
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ ؕ	یہ وہ لوگ هیں: * جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی ہے
وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ۚ	* ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے
وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۞	* اور نتیجتاً وہ سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علم اور اہلِ علم پر ان کے اثرات (آخری قسط)

زمین کی پیداواری صلاحیت، زیرِ زمین ذخائر، اور زمین پر بلند و بالا پہاڑی سلسلوں میں پوشیدہ خزائن و معدنیات، سمندروں اور دریاؤں میں موجود غذا اور جواہرات کو انسان اپنے علم، تجربہ اور محنت کے ذریعہ دریافت کر سکتا ہے۔ جوں جوں انسان کا علم اور تجربہ بڑھتا جائے گا وہ کاشت کاری اور زمین سے بہتر پیداوار حاصل کرنے کے لیے نئی نئی اور مفید ایجادات کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں کو اس کے دیے ہوئے احکام کے مطابق استعمال کر کے خود بھی فائدہ اٹھائے اور مخلوقِ خدا کو بھی فائدہ پہنچائے۔

بحث و تحقیق، دریافت اور ایجاد کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ انسان نے خزائن الارض، معدنیات اور توانائی کی بہت سی شکلیں تلاش کر لی ہیں، لیکن معلوم نہیں ابھی کتنے اور خزانے ہیں جو ابھی تک دریافت نہیں ہو سکے، ان کی تلاش کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

انسانیت اور انسانی معاشرے کے لیے مفید مصنوعات تیار کرنے، اچھی صنعتوں کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ فنی علوم کی تعلیم و تربیت کا مزید بہتر انتظام کیا جائے، دنیا بھر میں بہت سی ایسی بیماریاں ہیں جن کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ کچھ نئے نئے امراض بھی پیدا ہو رہے ہیں اس لیے طب کے شعبہ میں مسلسل تحقیق و دریافت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ کوئی بیماری ایسی نہیں ہے جس کی دوا اور علاج اللہ تعالیٰ نے پیدا نہ کیا ہو۔[۱] مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ خیر کے اس کام کو انجام دیں، خیر الناس من

---

[۱] لکل داء دواء، بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الطب، باب ما انزل اللہ من داء (حدیث ۵۶۷۸)

ینفع الناس، بہتر انسان وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ [۱]

قرآن حکیم نے نظریۂ تسخیر کائنات اسی لیے پیش کیا ہے تاکہ انسان کی فکری اور علمی جولان گاہ صرف زمین اور گردو پیش کے ماحول تک محدود نہ رہے بلکہ ارض وسماء، شمس وقمر اور افلاک وخلا کی وسعتیں بھی اس کی بحث وتحقیق کا محور بنیں۔ [۲]

اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ''واسع'' ہے۔ یہ بھی علیم کے ساتھ متصل چھ مقامات پر قرآن مجید میں مذکور ہے اور ہر جگہ علیم پر مقدم ہے۔ واسع کی صفت اللہ تعالیٰ کی قدرت، رزاقیت، اس کی صفتِ جُودوسخا، زمان ومکان، اس کی رحمت ومغفرت اور اس کے علم میں وسعت کو ظاہر کرتی ہے۔ [۳]

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اقتدار واختیار کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿115﴾﴾ [البقرہ ۲:۱۱۵]

(اور مشرق ومغرب سب علاقے اللہ ہی کی ملکیت ہیں، لہٰذا تم جس جانب رخ کرو گے اسی طرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو پاؤ گے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت وسعت رکھنے والا اور بہت جاننے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی وسیع قدرت کو ایک عمدہ تمثیل میں بھی بیان فرمایا ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ

---

[۱] خیر الناس من ینفع الناس، کنز العمال ۸:۲۰۱، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: أحب الناس الي الله أنفعهم للناس۔ دیکھیے: الطبرانی، الاوسط والصغیر

[۲] تسخیر سے متعلق چند آیات کے حوالے: الرعد ۱۳:۲؛ ابراہیم ۱۴:۲۳، ۳۳؛ النمل ۱۶:۱۲؛ الحج ۲۲:۶۵؛ فاطر ۲۵:۱۳؛ الجاثیہ ۴۵:۱۳ وغیرہ

[۳] الاصفہانی، راغب، مفردات ص ۸۷۰، دیگر آیات دیکھیے: البقرہ ۲:۲۴۷، ۲۶۸؛ آل عمران ۳:۷۳؛ المائدہ ۵:۵۴

عَلِيۡمٌ ﴿۲۶۱﴾ ﴾ [البقرہ ۲:۲۶۱]

(جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے زمین میں گندم کا ایک دانہ بویا پھر ایک دانے سے سات بالیاں پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ بہت وسعت والا اور بہت علم والا ہے)۔

اس مضمون کی وضاحت احادیثِ نبوی میں بھی ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نیک کاموں کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے۔ "واسع علیم" کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی کہ اللہ تعالیٰ کی غیر محدود وسعت کو بندہ اپنی تنگ دامانی پر قیاس نہ کرے، دینے والے کا خزانہ بھی وسیع ہے اور اس کا علم بھی وسیع ہے۔ (۱)

ان آیات کریمہ کا مطالعہ انسانوں میں فکر و نظر اور قلب و ذہن میں وسعت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ علمی وسعت کے ساتھ اگر فکر و نظر اور قلب و ذہن میں وسعت پیدا نہ ہو تو اس علم کا کوئی فائدہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنگ نظری علم کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہے، تنگ نظری جہالت کی علامت ہے، اس سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے۔

''شاکر'' بھی اللہ تعالیٰ کی ایک صفت کے طور پر علیم کے ساتھ متصل آتا ہے، اور ہمیشہ علیم پر مقدم ہوتا ہے۔ شاکر کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد بندوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات اور ان کے اعمال و عبادات کی جزا ہوتی ہے، یا اعمال کی قدر شناسی ہوتی ہے۔ (۲)

قرآن حکیم میں شاکر بطور اللہ تعالیٰ کی صفت کے صرف دو مقام پر علیم کے ساتھ اور علیم پر مقدم آیا ہے، سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

﴿وَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۵۸﴾ ﴾ [البقرہ ۲:۱۵۸]

---

(۱) اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن ۱:۵۶۹

(۲) الاصفہانی، راغب، مفردات الفاظ القرآن، ص ۴۶۲

(جو شخص بھی بھلائی کا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے عمل کی قدر بھی کرتے ہیں اور [اس کے بارے میں] علم بھی رکھتے ہیں)۔

فرائض کی ادائیگی تو تمام مسلمانوں پر لازمی ہے لیکن نفلی عبادات واجب نہیں، البتہ اگر کوئی مومن نفلی عبادت ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی قدر فرماتے ہیں اور اس کی جزا بھی دیتے ہیں۔ سورنساء میں ارشاد ہے:

﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿147﴾﴾ [النساء ۴:۱۴۷]

(بھلا اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ تمہیں ضرور عذاب دے اگر تم اس کے شکر گزار بندے ہو اور اس پر ایمان رکھتے ہو، اللہ تعالیٰ تو بہت قدر کرنے والے اور بہت علم رکھنے والے ہیں)۔

اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے اچھے اعمال کی قدر فرماتے ہیں اور اپنے ان بندوں کے اعمال وعبادات کو قبول فرماتے ہیں جو اپنی زبان اور اپنے قلب و عمل سے اپنے منعم کی نعمتوں اور اس کے احسانات کی قدر کرتے ہیں، اور اپنے دل میں شکر و امتنان کے جذبات رکھتے ہیں۔

علم کی صفت اہل علم میں شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ صاحبِ علم نہ صرف اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شعور رکھتا ہے بلکہ انسانوں کی جانب سے بھی بھلائی، خیر کے کاموں اور تعاون پر ان کا شکر گزار ہوتا ہے۔ ناشکری خواہ اللہ تعالیٰ کی ہو یا انسانوں کی جہالت کی علامت ہے، اہلِ علم کا یہ شیوہ نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام علیم سے مؤخر آتے ہیں، ایک حلیم ہے اور دوسرا قدیر۔ حلیم کے معنی ہیں ضبط نفس، تحمل، بردباری و سنجیدگی۔ امام راغب اصفہانیؒ نے اس کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔ ضبط النفس والطبع عن هيجان الغضب، یعنی جوش اور غیظ و غضب کی حالت میں اپنے نفس پر کنٹرول رکھنا۔ [۱] حلم کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف

[۱] الاصفہانی، راغب، مفردات الفاظ القرآن، ص ۳۵۳

ہوتی ہے تو اس کا مطلب اللہ تعالیٰ کی عظمت و وقار ہوتا ہے، وہ ہستی مراد ہوتی ہے جو اپنے گناہ گار بندوں کو فوری طور پر سزا نہیں دیتی بلکہ انہیں اصلاح کے لیے پوری مہلت دیتی ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے وراثت اور وصیت کے احکام بیان فرمائے ہیں، اور فرمایا ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ﴾ [النساء ۴: ۱۲] (اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں اور نہایت بردبار ہیں)۔ سورہ حج میں مسلمانوں پر کفار مکہ کے ظلم و ستم کا تذکرہ ہے، بہت سے مسلمان کفار مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر ہجرت کر گئے تھے، اللہ تعالیٰ ان اہل ایمان کو اپنی صفات کا حوالہ دے کر اطمینان دلاتے ہیں کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور یہ کہ تمام معاملات کا اختیار اسی کے قبضے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کر کے جانے والوں کو اور انہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا گیا، اللہ انہیں ان کے حسن عمل کی پوری پوری جزا عطا فرمائے گا، ان کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿59﴾﴾ [الحج ۲۲: ۵۹]
(اور اللہ تعالیٰ انہیں ایسے مقامات پر پہنچائے گا جسے وہ پسند کریں گے، اور یقیناً اللہ تعالیٰ بہت علم والا ہے اور بہت بردبار ہے)۔

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے نکاح و طلاق کے احکام بیان فرمائے ہیں، بیوی کو ساتھ رکھنے کے بارے میں اسلام کی تعلیم ہے "امساك بمعروف" یعنی اپنے پاس اچھے طریقے سے رکھیں اور اگر بالفرض ساتھ گزارا نہیں کر سکتے الگ ہونا ہی ہو تو الگ ہونے کا بھی مہذب طریقہ ’’تسریح باحسان‘‘ ہے یعنی علیحدگی بھی حسن سلوک کے ساتھ ہونی چاہیے۔ نکاح کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت کو بیان کر کے قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿51﴾﴾ [الاحزاب ۳۳: ۵۱]
(تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، اور وہ نہایت بردبار ہے)۔

یہ وہ مقامات ہیں جہاں انسان جلد بازی، غصہ اور غضب کا مظاہرہ کرتا ہے جو حقیقت

میں اہلِ علم کے مزاج کے منافی ہے۔علم کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان اپنی ازدواجی زندگی میں بھی اور طلاق و علیحدگی کی صورت میں نہایت تحمل، بردباری اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرے، اپنے فیصلوں میں اپنی رائے قائم کرنے میں یا نتائج اخذ کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔

حِلم اگرچہ انفرادی صفت ہے لیکن اجتماعی نظم اور امن وسلامتی کے قیام میں اس کا کردار بہت موثر ہوتا ہے، لہٰذا فروغِ تعلیم وتربیت کا منہج ایسا ہونا چاہیے کہ طالب علم میں حصول علم کے ساتھ تحمل، بردباری اور برداشت کا مادہ بھی پیدا ہو۔ وہ عالم جو حلیم بھی ہو وہی ایک بہتر معاشرہ کی تشکیل میں مثبت کردار ادا کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا دوسرا صفاتی نام جو علیم کے بعد متصلاً آتا ہے وہ قدیر ہے۔قرآنِ حکیم میں چار مقامات پر یہ صفت علیم کے بعد آئی ہے۔

قدرت کا لفظ جب انسان کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب اس کی محدود صلاحیت ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے کسی کام کو انجام دینے کے لیے عطا کی ہے۔ انسان اس محدود قدرت میں علم و عقل اور تجربہ کی روشنی میں اضافہ کرسکتا ہے، لیکن انسان کی یہ قدرت و صلاحیت کبھی بھی لامحدود نہیں ہوتی۔ جب قدرت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس کے دو مفہوم ہوتے ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کی ذات سے عجز اور محال کی نفی کی جارہی ہوتی ہے، دوسرے اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے جو ہر کام کے لیے لامحدود اور مطلق ہے۔ قدیر کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے، اگرچہ قادر بھی اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن انسانوں کے لیے بھی قادر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم وقدرت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ؀﴾ [النحل۱۶:۷۰]

(اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں پیدا کیا، پھر وہی تمہیں موت کا ذائقہ چکھاتا ہے، تم میں سے بعض لوگ بڑھاپے اور کمزوری کی اس حد کو پہنچ جاتے ہیں کہ انہیں بہت کچھ جاننے کے باوجود

کچھ یاد نہیں رہتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں اور [موت کے بعد دوبارہ زندگی دینے پر] قدرت بھی رکھتے ہیں)۔

سورۂ روم میں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل کو اور پھر ارتقا کے بعد تنزل کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ﴾[الروم ۳۰: ۵۴]

(اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمھیں نحیف وکمزور حالت میں پیدا کیا، پھر کمزوری کے بعد [جوانی کی] طاقت وقوت عطا کی، پھر طاقت وتوانائی کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دیا۔ وہی ذات ہے جو ہر چیز کا علم بھی رکھتی ہے اور ہر چیز پر قدرت بھی رکھتی ہے)۔

سورۂ فاطر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے مظاہر کو نئے انداز سے بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ انسان کی توجہ ماضی کے واقعات اور تاریخی حقائق کی طرف مبذول کراتے ہیں کہ ہر وہ انسان جو تھوڑا بہت علم رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے عقل وحواس بھی عطا فرمائے ہیں، اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس وسیع وعریض سرزمین میں سیر وسیاحت کرے اور دیکھے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی طاقت ور اقوام کو جو بڑی سلطنت وحکومت کے مالک تھے کس طرح نہ صرف اقتدار سے محروم کیا بلکہ اپنی سرزمین سے بھی نیست ونابود کر دیا۔ ان کا یہ انجام کیوں اور کیسے ہوا؟ اسے سمجھنے اور اس سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کائنات میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے کسی بھی معاملہ میں مداخلت کر سکے، کوئی قوت ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کو کسی کام سے روک سکے۔ یہ سارا مضمون بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا﴾ [فاطر ۳۵: ۴۴] (یقیناً اللہ تعالیٰ علم بھی رکھتا ہے اور قدرت بھی رکھتا ہے)۔

سورہ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وسعت علم کو اس طرح بیان کیا ہے:

﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿49﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿50﴾﴾ [الشوریٰ ۴۲: ۴۹، ۵۰]

(ارض وسماء پر حکومت واقتدار اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے دونوں بیٹے اور بیٹیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے بانجھ رکھتا ہے بے شک وہی علم بھی رکھتا ہے اور قدرت بھی رکھتا ہے)۔

انسان اللہ تعالیٰ سے صرف دعا کرسکتا ہے، اس کے کسی عمل میں دخل اندازی نہیں کرسکتا، لہٰذا انسان کو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر بھروسہ کرنا چاہیے، صبر وتحمل کے ساتھ خیر کی امید رکھنا چاہیے اور اپنے تئیں خیر کے کاموں کے لیے جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔

ان آیات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ علم قدرت پر مقدم ہے، جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا تعلق ہے تو علم اور قدرت دونوں اس کی ازلی اور ذاتی صفات ہیں لیکن انسان کسی بھی کام پر قدرت حاصل کرنے کے لیے پہلے متعلقہ علم حاصل کرتا ہے، انسان اپنے علم میں جس قدر وسعت و گہرائی پیدا کرے گا اتنا ہی اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنا سکے گا۔ اپنی معاشرتی، معاشی زندگی، ملک وملت کے نظم ونسق اور اپنے فرائض کی انجام دہی پر اپنی قدرت و استطاعت کو زیادہ بہتر اور موثر بنا سکتا ہے۔

''حکیم'' اللہ تعالیٰ کی ایک اہم اور نمایاں صفت ہے۔ یہ صفت قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی صفت ''علیم'' کے ساتھ متصل بہت کثرت سے وارد ہوئی ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو علیم سے مقدم بھی آتی ہے اور موخر بھی، کہیں علیم حکیم آتا ہے اور کہیں حکیم علیم۔ قرآن حکیم میں یہ صفت مقدم وموخر سیاق وسباق کے مطابق آتی ہے، اگر مضمون کا ارتکاز اللہ تعالیٰ کی حکمت پر ہو تو حکیم مقدم ہوتا ہے اور اگر علم پر ارتکاز ہو تو علیم مقدم ہوتا ہے۔ [۱] جہاں اللہ تعالیٰ تشریعی احکام بیان کرتے ہیں، یا جہاں جزاء وسزا کا ذکر ہوتا ہے وہاں صفت حکیم علیم پر مقدم آتی ہے۔

---

[۱] اللہ تعالیٰ کی صفت حکیم جس طرح علیم کے ساتھ متصل آتی ہے اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کی صفت عزیز کے ساتھ بھی بہت کثرت سے آتی ہے۔ قرآن حکیم میں ۴۷ جگہوں پر العزیز الحکیم آیا ہے۔

علم کا حکمت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب کوئی انسان علم کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بناتا ہے اور مختلف تجربات سے گزرتا ہے، اپنی عقل و حواس اور غور و فکر کی صلاحیت کو علم وحی کی روشنی میں استعمال کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں حکمت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ حکمت ہے جسے قرآن حکیم خیرِ کثیر کہتا ہے، جس کی تعلیم کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا[1] اور جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حکمت تو مومن کا گم کردہ سرمایہ ہے، لہٰذا جہاں سے بھی ملے اسے حاصل کرو۔

قرآن حکیم اور سنت طیبہ کے مطالعہ سے حکمت کا جو مفہوم ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہجِ تزکیۂ نفس اور تعلیمِ کتاب کے نتیجہ میں جو مؤمنانہ فراست پیدا ہوتی ہے وہ حکمت کہلاتی ہے۔ ہمارے بعض محدثین نے الحکمۃ سے مراد سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لیا ہے، اس لیے کہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اقوال و احادیث رسول ہی قرآن حکیم کی تفسیر و تعبیر کہلاتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مضامین قرآن کی تعلیم اپنے قول و عمل سے دی ہے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول و عمل ہی خیرِ کثیر اور عظیم الشان بھلائی ہے۔[2]

وہ علم جو انسان میں حکمت و دانائی کا شعور پیدا کرے وہی علم نافع کہلاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے علمِ نافع کے لیے دعا کرتے رہیں۔ علمِ نافع کے نتیجہ میں حکمت پیدا ہوتی ہے پھر جب انسان میں حکیمانہ فہم پیدا ہوتی ہے تو وہ علمِ نافع کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس طرح انسان علم کے ذریعہ حکمت اور حکمت کے ذریعہ علم کے اعلیٰ مقامات حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ مؤمن کی زندگی میں بغیر کسی توقف کے جاری رہتا ہے۔

قرآن حکیم میں تقریباً ستائیس یا اٹھائیس آیات ہیں جہاں علیم حکیم ایک ساتھ آیا ہے۔ سات مقامات پر حکیم علیم پر مقدم ہے باقی جگہوں پر علیم حکیم پر مقدم ہے۔

بطور نمونہ یہاں چند آیات نقل کی جا رہی ہیں۔ ان سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ کس قسم

---

[1] ویعلمھم الکتاب والحکمۃ [البقرۃ ۲:۱۲۹]

[2] البقرۃ ۲:۲۶۹؛ النساء ۴:۱۱۳؛ الاسراء ۱۷:

کے مضمون کے ساتھ علیم حکیم یا حکیم علیم آتا ہے۔سورہ زخرف میں ارشاد ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝84﴾

[الزخرف ۴۳: ۸۴]

(آسمانوں میں بھی وہی الٰہ ہے اور زمین پر بھی اسی کی خدائی ہے، وہی حکمت والا اور علم والا ہے)۔

اس آیتِ مبارکہ میں مشرکین کے غلط تصورات کو رد کر کے اللہ تعالیٰ کی ارض وسماء میں اپنی الوہیت اور اپنی قدرت کو بیان کر کے بتا دیا ہے کہ اس کے فیصلے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان فیصلوں کے پیچھے اس کا علم کارفرما ہوتا ہے۔

﴿وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝6﴾ [النمل ۲۷: ۶]

(اور بے شک قرآن کریم آپ کو اس ذات کی جانب سے عطا کیا جا رہا ہے جو حکیم بھی ہے اور علیم بھی ہے)۔

جہاد سے متعلق احکام دیتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝104﴾

[النساء ۴: ۱۰۴]

(دشمن کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ، اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو انہیں بھی تو تکلیف پہنچی ہے، تم تو اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہو وہ تو اللہ تعالیٰ سے امیدیں نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے وہ بڑی حکمت والا ہے)۔

حکمت اور علم لازم وملزوم ہیں، ہر وہ شخص جو قرآن وسنت کا طالب علم ہے، یا وہ لوگ جو علوم وفنون کے حصول میں مصروف رہتے ہیں ان میں اگر حکمت ودانائی بھی پیدا ہو رہی ہے تو وہ کامیاب زندگی کی طرف بڑھتے چلے جائیں گے، خاص طور پر ایسے طالبانِ علم جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں علم وحکمت کا بہترین امتزاج اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نظر

آتا ہے، یہی روشنی کا حقیقی منبع ہے، اس منبع سے علم وحکمت کا اقتباس کرتے رہنا چاہیے۔

ہم نے مذکورہ بالا بحث میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، نیز اس پہلو کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والے کے دل ودماغ پر اللہ تعالیٰ کی صفاتِ علمیہ کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم کا قاری اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے دل ودماغ کو علم کی روشنی سے منور کرنا چاہتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا سلسلہ بھی اسی لیے جاری فرمایا کہ وہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کا تزکیہ کریں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا یہ فریضہ بہت احسن طریقہ سے انجام دیا۔

حصولِ علم سے قبل تزکیۂ نفس کے عمل سے گزرنا اس لیے ضروری ہے کہ علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لیے قلب ودماغ کی پاکیزگی اور صفائی ضروری ہے۔

تزکیۂ نفس کے عمل سے طالب علم گزرتا ہے تو اس کے کردار اور رویہ پر دو قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں عاجزی وانکساری پیدا ہو جاتی ہے، پھر جب ایک مؤمن کا ذاتِ علیم وخبیر کے ساتھ عاجزانہ تعلق مضبوط ہو جاتا ہے تو اس میں تلقی علم کی صلاحیت بہت بہتر ہو جاتی ہے۔

دوسرا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ صاحبِ علم کے مزاج سے غلو، تکبر اور ریا جیسی منفی برائیاں ختم ہوتی ہیں اور اس کے مزاج ورویہ میں تحمل وبردباری اور عاجزی وانکساری جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہے۔

اللّٰھُم عَلِّمنا ما یَنفعنا وانفعنا بما عَلِّمتَنا، إنك أنت العلیم الحکیم۔

تعلیم و تربیت ادارہ

بچوں کو کہانیاں کیسے سنائی جائیں؟

قصے کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔ عمر کے مختلف حصوں میں بچوں کو مختلف قسم کی کہانیوں کا شوق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ بچوں کے لیے کہانی میں خوف کا عنصر نہ ہو۔

۲۔ کہانی میں سموئے گئے نظریات حقیقت سے قریب تر ہوں تا کہ بچہ منتشر الخیالی سے محفوظ رہے۔

۳۔ کہانی کی زبان عام بول چال کی زبان سے قریب تر ہونی چاہئے۔

۴۔ مافوق الفطرت کردار مثلاً جن بھوت وغیرہ کی کہانیاں چھوٹے بچوں کو نہیں سنانی چاہئیں۔ اس سے بچے توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں اور خیالی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔

۵۔ کہانی سنتے ہوئے بچے کے ذہن میں کئی طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے سوالات آپ کے خیال میں کتنے ہی لایعنی کیوں نہ ہوں، ان کو غور سے سن کر بچے کے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش چاہیے۔ ظاہر ہے بچہ فلسفیانہ جوابات نہیں مانگتا وہ تو سیدھے سیدھے الفاظ میں سیدھے سیدھے جوابات سے ہی مطمئن ہوسکتا ہے۔ جوابات نہ دے سکیں تو بچے کو ٹرخانے یا جھڑکنے کی پالیسی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

* دو سے تین سال کے بچے جانوروں اور چھوٹے بچوں کی کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ کہانی کا موضوع اور کردار کچھ بھی ہو اس کا مقصد بڑا واضح ہونا چاہئے۔ کہانی مختصر اور نتیجہ خیز ہونی چاہیے۔

* کہانی میں اچھائی فاتح ہوتی نظر آئے اور برائی مغلوب ہوتی دکھائی دے۔

* کہانی اخلاقی فضائل ورذائل ذہن نشین کرنے میں بہت اثر رکھتی ہے۔

مثلاً ڈیڑھ دو سال کا بچہ چڑے چڑیا کی کہانی کو خوب سمجھ لیتا ہے۔ اسے بتایئے ’’ایک

چڑا تھا۔ ایک چڑیا تھی۔ چڑا چاول کا دانہ لایا۔ چڑیا دال لائی دونوں نے مل کے کھچڑی پکائی۔ پھر مل کر کھالی۔ دونوں بڑے اچھے تھے، مل کر کام کرتے تھے، لڑتے بھی نہیں تھے۔ ان کے ساتھ والے گھر میں ایک کوا اور مینا رہتے تھے۔ ایک دن کوا مینا کے سارے انڈے کھا گیا۔ بڑا برا تھا کوآ لالچی کہیں کا!'' کہانی کے مکالمے اور الفاظ روزمرہ کی گفتگو کے مطابق ہوں تو بچے کو سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ کتابوں میں پڑھی جانے والی کہانیوں میں معمولی ردوبدل کر کے بچے کو حسبِ منشا صفات ذہن نشین کرانے والی کہانیاں سنائی جاسکتی ہیں۔

* کہانی کا موضوع تلاش کرتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ آپ بچے کو کس تہذیب کس معاشرے اور کس کردار کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ بچے کے ذہن کو سمجھ کر اس کے فہم کے مطابق بات کرنے کا ڈھنگ آجائے تو وہ ہر بات سننے اور ماننے کو تیار ہوتا ہے۔

* کہانی سنانے کے لیے کوئی وقت مخصوص نہیں ہوتا۔ چلتے پھرتے کھانا کھاتے، نہاتے دھوتے غرض کسی بھی وقت کہانی سنائی جاسکتی ہے مثلاً کھانا کھاتے ہوئے ''آہا! میری بیٹی ادھر بیٹھ کر کھانا کھائے گی میری منی بسم اللہ پڑھے گی۔ پھر میں اسے چھوٹے چھوٹے لقمے دوں گا۔ پتہ ہے کیا ہوا؟ ایک دن پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کھانا کھانے لگے۔ ان کے پاس ایک منا سا بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا وہ بھی کھانا کھانے لگا! اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے بتایا! اچھے بچے آرام سے بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے لقمے کھاتے ہیں۔'' اور آپ کو معلوم ہے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیشہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاتے تھے۔

اسی طرح نہلاتے ہوئے بھی کہانی سنائی جاسکتی ہے ''واہ جی وہ! میرا بیٹا نہائے گا! پاک صاف ہو جائے گا۔ پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہتے تھے جو بچے صاف ہوتے ہیں جن کے منہ اور ہاتھ صاف ہوتے ہیں، وہ اللہ پاک کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ پتا ہے اللہ پاک خوش ہوں تو کیا دیتے ہیں؟ جی ہاں! مزے مزے کی چیزیں، بڑے بڑے باغ، ان میں جھولے، رنگ برنگی چڑیاں اور ہاں! وہاں پیارے پیارے پھول بھی ہوں گے۔ فوارے بھی! آہا! آئے گا مزہ۔'' یوں بات ہی بات میں اس صاحبِ مطلوب کی بات کی جائے گی تو بچے کو یہ حقیقت

ذہن نشین ہو جائے گی کہ اسے ہر کام اسی طریقہ سے کرنا ہے جیسے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کرتے تھے۔

اس صاحبِ خُلق عظیم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنا سکھانے کے لیے ان کی محبت کی کہانیاں سنائیے۔ مثلاً ''ایک درخت تھا ایک پیاری سی سرخ چڑیا نے اس میں اپنا گھر بنا لیا۔ اللہ میاں نے اسے ننھے منے دو بچے دیئے۔ بڑے پیارے سے بچے تھے، چوں چوں کرتے بڑے اچھے لگتے تھے۔ ایک دن اس درخت کے پاس بہت سے لوگ آ گئے۔ ایک آدمی نے چڑیا کے ننھے منے بچے دیکھے تو اسے بہت اچھے لگے۔ اس نے کہا یہ بچے اپنے ننھے سے بیٹے کے لئے لے جاؤں گا۔ وہ انہیں دیکھے گا، ان کے ساتھ کھیلے گا تو بہت خوش ہوگا اس نے دونوں بچے اٹھا لئے۔ چڑیا نے دیکھا کہ اس کے بچے آدمی نے اٹھا لیے ہیں تو وہ روتی ہوئی پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئی۔ چیں چیں کر کے اس نے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بتایا کہ اس کے بچے ایک آدمی نے لے لیے ہیں۔ پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں سے پوچھا ''چڑیا کے بچے کس نے لیے ہیں؟'' ایک آدمی نے کہا: ''پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! چڑیا کے بچے میں نے لیے ہیں مجھے چڑیا کے لال لال چھوٹے چھوٹے بچے بڑے اچھے لگے ہیں۔ مَیں نے لے لیے کہ میرا بیٹا ان سے کھیلے گا؟ پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بُری بات! چڑیا کے بچے ان کی امی کو دے دو، بچے اداس ہو جاتے ہیں، امی بھی اداس ہو جاتی ہیں'' آدمی بڑا اچھا تھا۔ اس نے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کہا مانا۔ چڑیا کے بچے اس کے گھونسلے میں واپس رکھ دیئے۔ چڑیا نے کہا: پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ کا شکریہ۔ پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کتنے اچھے ہیں۔ کتنے پیارے ہیں۔

یوں پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور شکایت کرنے والی اونٹنی کی کہانی سنائی جا سکتی ہے۔

رونے والے کھجور کے تنے کی کہانی سنا سکتے ہیں۔

اونٹوں کی دوڑوں کی کہانی سنا سکتے ہیں۔

غارِ ثور کے دہانے پر انڈے دینے والی کبوتری کی کہانی سنا سکتے ہیں۔

یقیناً آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہر کہانی سبق آموز ہے جن سے بچوں کو ایک اچھا سبق دیا جا سکتا ہے۔

FREE

رمضان المبارک میں

فہمِ قرآن کلاس

روزانہ ایک پارے کا مختصر مفہوم وخلاصہ

صبح 11:00 بجے تا 12:30 بجے تک

برائے مرد حضرات، طلبہ وریٹائرڈ افراد
(خواتین وطالبات کے لیے بھی انتظام ہے)

کامیاب شرکاء کو سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا

مدرسین

مولانا حافظ محمد عمران طحاوی (فاضل درس نظامی وپی ایچ ڈی سکالر علوم اسلامیہ)
ڈاکٹر محمد امین (پروفیسر علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی ویو ایم ٹی)

تحریکِ رجوع الی القرآن

مکان نمبر 178، گلی نمبر 2، نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
برائے معلومات: فون نمبر 0300-4107282

تعلیم و تربیت

امیر حمزہ

بچوں کی تربیت کا ایک غلط منہج

زمانۂ طالب علمی میں مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ کی آپ بیتی میں ان کے بچپن کا واقعہ پڑھا کہ ایک مرتبہ ان کے والد مولانا یحییٰؒ نے انہیں تکیہ لانے کا حکم دیا تو جواب میں ان کے منہ سے نکلا ''میرا تکیہ؟'' والد گرامی مولانا یحییٰؒ نے اس پر اچھی خاصی تادیب کی کہ ابھی سے تمہارا تکیہ؟

مَیں نے یہ آپ بیتی نوعمری میں پڑھی تھی۔ اس وقت مولانا کی جگہ خود کو رکھ کر سوچا تو ان کے والد گرامی کا یہ "سلوک" بہت عجیب سا لگا۔ ہمیشہ آپ کی آپ بیتی میں یہ واقعہ کھٹکتا رہا۔ وقت گزرتا گیا۔ اب جب نوعمری کا کچا شعور کچھ پکنے لگا ہے تو پتا چلا کہ یہ واقعہ میری عقل سے بڑا تھا۔

موجودہ دور میں نوخیز بچوں کی عادات واطوار میں بگاڑ اور ان کی بداخلاقی کا سب سے بڑا باعث ان کی انا کی پرورش ہے۔

تربیت کے جدید ڈسکورس میں بچے کی انا کی پرورش کو ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس سے بچے میں خوداعتمادی، فیصلہ سازی اور اپنی شخصیت میں نکھار آتا ہے۔ جدید سکول بھی تربیت اسی نہج پر کر رہے ہیں۔ آپ بچوں کی تربیت سے متعلق کسی بھی موٹیویشنل سپیکر کو سن لیں وہ یہی جملے دہراتا نظر آئے گا حقیقت مگر خوفناک حد تک اس کے برعکس ہے۔ کچے شعور کی خوداعتمادی اور فیصلہ سازی بالکل وہی پوزیشن رکھتی ہے جیسے ٹریننگ کے بغیر اسلحہ تھما دینا یا لائسنس کے بغیر بچے کو گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دینا۔

بچہ شعوری بلوغت اٹھارہ بیس سال کے بعد حاصل کرتا ہے۔ اس عمر تک بچے کی تربیت فطرت کے عین مطابق "جذبات" کے ذریعے کی جانی چاہیے۔ بچے کو کبھی یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ وہ فیصلہ سازی میں خودمختار ہے۔ جدید جوڑے ''خوداعتمادی'' سکھانے کے عنوان

سے جو بے ڈھنگے تجربات اپنے بچوں پر آزمارہے ہیں یہ بچوں کو وقت سے پہلے پکّا کر رہا ہے۔ معصومیت اور شرمیلے پن کی فطری جھلی جو کسی دور میں بیس بائیس سال کی عمر میں جھڑتی تھی اب بچے کی بدنی بلوغت سے بھی پہلے اسے کُھرچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

خدارا اپنے بچوں کو معصوم رہنے دیجیے۔ وہ چپ رہتے ہیں تو پریشان مت ہوں۔ وہ نظر نیچی رکھتے ہیں تو ماہرِ نفسیات سے شکایت مت کریں۔ جسے ہم بچے کی ہیزیٹیشن (Hesitation) کہتے ہیں یہ اس کی فطری نجابت اور شرافت ہے۔ یہ خدا کی عطا ہے۔ یہ بچے میں مستور وہ خزانہ ہے جس کی ضرورت اسے بلوغت کے بعد پیش آئے گی۔ بچے کی یہ ہیزیٹیشن اس کی ابلتی جوانی کا درجۂ حرارت اعتدال میں لائے گی۔ یہی اعتدال عمر بھر اس کے کام آئے گا۔ ورنہ وہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ خود اعتمادی کی بھٹی میں پکا ہوا آپ کا بچہ جب جوان ہوتا ہے تو وہی منظر پیش کرتا ہے جو قربانی کے موقع پر بپھرا ہوا بیل۔ ایک دن استاد شکایت لے کر والد کے پاس پہنچا ہوتا ہے تو اگلے دن والد اس کے استاد کے پاس۔۔۔ اچھے کام پر بچے کی حوصلہ افزائی ضرور کیجیے، مگر وقت سے پہلے اس کے کندھوں پر سٹار مت لگائیے مبادا وہ گھر ہی میں مارشل لاء نافذ کر دے۔

بقیہ: دینی سیاسی جماعتوں کے لیے متبادل پروگرام

* معاشرتی تنظیم سے مسجد کو مرکز بنا کر پرائیویٹ سیکٹر میں عدل وانصاف، امن وامان، غربت میں کمی، خدمتِ خلق، غیر سودی تجارت وغیرہ کے بیشتر کاموں کو اسلامی خطوط پر منظم کر کے اسلامی معاشرے کے قیام کی کامیاب جدوجہد کی جاسکتی ہے۔

* یاد رہے کہ اصلاح یافتہ افراد کی تعداد جتنی بڑھتی جائے گی اتنا ہی معاشرہ اور ریاست اسلامی ہوتی جائے گی اور ضرورت وصلاحیت ہو تو ہلّہ مار کر انتخابات یا سِول نافرمانی یا احتجاج کے ذریعے سیاسی جدوجہد کو کامیاب بنایا جاسکتا ہے اور اسے اسلامی منہج پر چلایا جاسکتا ہے۔

تعلیم/تزکیۂ نفس مدیر

رمضان کے لیے پلاننگ کیجیے

رمضان آرہا ہے۔آپ نے اس کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ روزہ رکھنے کے علاوہ آپ مندرجہ ذیل امور پر عمل کرنے کا سوچیں:

* اگر آپ باقاعدہ نماز نہیں پڑھتے تو پنجوقتہ نماز پابندی کے ساتھ شروع کر دیجیے۔

* اگر آپ با جماعت نماز نہیں پڑھتے تو اب جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دیں۔

* اگر پ پہلے سے با جماعت نماز پڑھتے ہیں تو اب نماز میں خضوع وخشوع کی طرف توجہ دیجیے تاکہ نماز کی کوالٹی بہتر ہو جائے۔

* اگر آپ تہجد نہیں پڑھتے یا کبھی کبھار پڑھتے ہیں تو اس رمضان میں باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دیجیے، خواہ دو رکعت ہی پڑھیے۔ چونکہ آپ نے سحری کے لیے جاگنا تو ہے ہی اس لیے رمضان میں یہ کام آسان ہوگا۔

* اگر آپ بے سمجھے قرآن ناظرہ پڑھتے ہیں تو اس دفعہ ترجمے کے ساتھ پڑھیے، یا صرف ترجمہ ہی پڑھ لیجیے۔

* دیگر معاصی غیبت، چغلی، بدزبانی، گالی گلوچ، جھگڑے سے بچیے۔ کسی کا دل نہ دکھائیے، کسی کے ساتھ زیادتی نہ کیجیے۔

* رزقِ حرام سے بچیے، اسراف سے پرہیز کیجیے اور غریبوں مسکینوں کی مدد کیجیے۔

تعلیم/تزکیۂ نفس

ڈاکٹر محمد زبیر [۱]

اپنی تنہائی بہتر بنائیے

محترم احمد جاوید صاحب کی اصلاحی مجلس میں تقریبا دو سال شرکت کا موقع ملا اور ان دو سالوں میں ان سے شاید دو لفظ ہی سیکھے ہیں۔ شروع میں تو سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ یہ کیا ہیں؟ لیکن جب لفظ معنی سے حال میں بدلنا شروع ہو تو الفاظ کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک لفظ ''تنہائی'' اور دوسرا ''سچائی'' ہے۔ جب سے یہ دو لفظ سیکھے ہیں تو سیکھنے کا مفہوم بھی تبدیل ہو گیا ہے کہ سیکھنا کسے کہتے ہیں؟ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ نہیں سیکھتے یا بہت کم سیکھتے ہیں۔

ان الفاظ کو وہ جملے میں عام طور یوں استعمال کرتے تھے کہ ''اپنی تنہائی کو بہتر بنا لو'' اور ''سچے بن جاؤ''۔ اب کہنے کو تو یہ عام سے جملے ہیں۔ آپ ان جملوں پر لمبا چوڑا وعظ سن لیں یا کہہ لیں، یہ سب سیکھنے میں شامل نہیں ہے۔ ''تنہائی'' کے لفظ کو سیکھ لینا یہ ہے، چاہے آپ ایک دن میں سیکھیں یا سال میں، کہ جب جب آپ کو تنہائی میسر ہو تو دل نماز کی طرف لپک لپک کر جائے۔

جس طرح تنہائی میں فلم دیکھنے کی رغبت محسوس ہوتی تھی، اب نماز پڑھنے کی رغبت ایسے ہی محسوس ہونے لگے۔ پہلے تنہائی میں گناہ سے روکنے کے لیے نفس سے مجاہدہ کرنا پڑتا تھا تو اب تنہائی کی نیکی چھوڑنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت محسوس ہو۔ اور پھر تنہائی، صرف بیڈروم کی تنہائی، تنہائی محسوس نہ ہو بلکہ اگر کہیں گاڑی میں اکیلے سفر میں ہے تو بھی تنہائی میں ہے حتی کہ جب جب خاموش ہے تو حالت تنہائی میں ہی ہے۔

جس طرح بیڈروم کی خلوت میں انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہوئے اپنی تنہائی کی حفاظت

---

[۱] پروفیسر علوم اسلامیہ، رفاہ یونیورسٹی، لاہور

کرنی ہے، اسی طرح بازار کی مجلس میں نظروں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی تنہائی کو بہتر بنانا ہے کہ چاہے کوئی اور نہ دیکھ رہا ہو لیکن وہ تو دیکھ رہا ہے کہ جو نظروں کی خیانت کا بھی حساب رکھتا ہے۔

اور سچا بننا صرف اپنے قول میں نہیں بلکہ حال میں بھی ہے۔ سچ صرف یہ نہیں ہے کہ جھوٹ نہ بولو بلکہ سچ یہ بھی ہے کہ سچ کو نہ چھپاؤ۔ سچا بننا یہ بھی ہے کہ جتنا نیک ہو، اتنا ہی نظر آئے۔ آپ کی بات چیت، گفتگو، حلیے اور وضع قطع سے کوئی آپ کو اتنا عالم فاضل اور متقی پرہیزگار نہ سمجھ لے جتنا کہ آپ نہیں ہیں۔ اور آپ کیا ہیں، آپ صرف وہی ہیں جو آپ اپنی تنہائی میں ہوتے ہیں نہ کہ مجلس میں۔

بھئی، سچا بننا یہ بھی نہیں کہ ''عاجز''، ''فقیر''، ''حقیر پُرتقصیر'' اور ''طویلب'' جیسے القابات استعمال کرنا شروع کر دیں، سچا بننا یہ ہے کہ جو ہیں، بس اس کا اظہار کریں اور وہی ہم اپنے قال اور حال سے نظر آئیں۔ اگر تو عالم دین ہیں تو اپنے آپ کو طویلب کہنے کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہی علامہ کہے جانے پر خوشی محسوس کریں، بس یہی کہیں کہ عالمِ دین ہوں۔ تکلیف اور بیماری میں ہیں، تو کوئی حال احوال پوچھے تو بتا دیں کہ تکلیف میں ہیں اور کچھ کھانے کو دل کر رہا ہے اور میزبان نے تکلفاً پوچھ لیا ہے تو بتا دیں کہ کھانے کو دل کر رہا ہے۔ تاجر ہیں تو اپنے مال کا عیب بھی بتائیں، چاہے گاہک نہ بھی پوچھے، پھر بھی بتائیں کہ اسی کا مطلب ہے کہ سچ نہ چھپائیں۔ اللہ عزوجل مجھے بھی اور آپ کو بھی ان دو جملوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین۔

تعلیم/تزکیۂ نفس ڈاکٹر طفیل ہاشمی

اللہ سے گِلہ شِکوہ

یوٹیوب پر ایک عرب شیخ ہیں جو لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک گفتگو میں وہ بتاتے ہیں کہ ایک عمل مَیں نے سینکڑوں لوگوں کو بتایا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کا مسئلہ حل نہ ہوا ہو۔ ایسے مسائل جنہیں لوگ ناممکن سمجھتے تھے، وہ بھی حل ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنے ایک دوست کا واقعہ بتایا کہ ان کی بیٹی جو اعلیٰ تعلیم واخلاق کی حامل تھی، اس کا شوہر اسے روزانہ یا ہر دوسرے تیسرے روز مارتا تھا اور وہ بہت پریشان تھے۔ مجھے کہا کہ آپ اسے سمجھائیں۔ میں نے کہا کہ دو صورتیں ہیں۔ کہو تو میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔ ممکن ہے سمجھ جائے اور ممکن ہے ردعمل میں زیادہ شدت پسند ہو جائے۔ دوسرا طریقہ میرا آزمودہ ہے، اس میں کبھی ناکامی نہیں ہوتی۔ مَیں نے ان کے کہنے پر دوسرا طریقہ بھی بتا دیا۔ عمرہ کرنے جاؤ وہاں جا کر اللہ سے گِلہ شکوہ کرو کہ میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے اور مَیں بے بس ہوں، تو ہی نظرِ کرم فرما۔

وہ صاحب چلے گئے۔ جا کر عمرہ کیا۔ دعا کی۔ روئے دھوئے، شِکوہ شکایت کی واپس ہوٹل پہنچے تو بیٹی کا پیغام تھا کہ مجھے فون کریں۔ پریشان ہو گئے کہ نہ معلوم کیا سننے کو ملے؟ فون کیا تو بیٹی نے بتایا کہ رات کے آخری پہر میرا شوہر آیا اور اپنی تمام زیادتیوں کا اعتراف کر کے رو رو کر مجھ سے معافی مانگتا رہا اور آئندہ کے لیے حسنِ سلوک کا وعدہ کیا۔

یہ پروگرام سن کر مجھے یاد آیا کہ ایک بار حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ سے گِلہ کیا تھا: ﴿اِنَّمَا اَشۡكُوۡ بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ یوسف علیہ السلام کی قمیص پہنچ گئی۔ دوسری بار رسول امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف کے اوباشوں سے پتھر کھا کر گلہ کیا: "الیك اشکو ضعف قوتی و قلة حیلتی و هوانی علی الناس" لمحوں میں پہاڑوں کا فرشتہ آ گیا۔ لیکن وہ آخری دن تھا۔ اس کے بعد ہر روز قبولیتِ عامہ بڑھتی گئی۔ دونوں جگہ ؎

اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید

لوگوں کے سامنے مشکلات کا ذکر لوگوں سے اللہ کی شکایت کرنا ہے جو بے ادبی ہے۔ لیکن اللہ سے گلہ کرنا اپنی بے بسی کا اعتراف ہے۔

رہا عمرہ تو اللہ کسی گھر کے ساتھ وابستہ نہیں

﴿هُوَ مَعَكُمۡ اَیۡنَمَا كُنۡتُمۡ﴾ تم جہاں بھی ہو گے وہ تمہارے ساتھ ہو گا۔

تفہیم دین مراد علی[۱]

مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی

بڑے لوگوں کا اختلاف بعض اوقات ٹریجڈی بن جاتی ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی مولانا مودودی سے الگ ہوئے تو ہر اس معاملے میں نہایت شدت کا موقف اختیار کیا جو مولانا مودودی کی فکر کا خاصہ سمجھا جاتا تھا۔

مثال کے طور پر ''خلافت و ملوکیت'' کے ردّ کے سلسلے میں محمود احمد عباسی کی کتاب کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں اور عباسی صاحب اسے اپنی کتاب پر بطور تقریظ لگاتے ہیں۔

مولانا مودودی سے الگ ہونے کی ایک بنیادی وجہ، بلکہ بہت بنیادی وجہ، آپ کا شوری میں امیر کی ویٹو پاور سے اختلاف تھا لیکن جنرل ایوب کے ساتھ مولانا کی سیاسی کشمکش میں مولانا اصلاحی جنرل ایوب کو فکری کمک فراہم کرتے رہے، فرماتے رہے کہ بادشاہت سے اسلام کو کوئی مسئلہ نہیں۔

علمی طور پر مولانا اصلاحی مولانا مودودی پر طنز کا کوئی موقع اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے ریکارڈڈ دروسِ قرآن موجود ہیں جن میں وہ مولانا مودودی پر بہت سخت چوٹیں کرتے ہیں، جو آپ کے مقام سے بالکل میل نہیں کھاتیں۔

مثال کے طور پر سورہ بقرہ میں مولانا مودودی نے 'الرحمن الرحیم' کی تفسیر میں بطور مثال لکھا ہے کہ جیسے ہم اردو میں لمبا تڑنگا کہتے ہیں۔ مولانا اصلاحی کہتے ہیں: آج کے دور میں کچھ لوگ، جن کی عربی اخباری قسم کی ہے، وہ مثال میں لمبا تڑنگا پیش کرتے ہیں۔ پھر وہ تعلّی کے ساتھ اپنی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

انہی دروس میں ایک جگہ مولانا اصلاحی سے کوئی پوچھتا ہے کہ ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' آپ نے پڑھی ہے؟ مولانا کہتے ہیں نہیں پڑھی، کیوں کہ میں مولانا مودودی میں یہ صلاحیت ہی نہیں دیکھتا کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔

اس کو محدود مشاہدہ کہہ لیں۔ مولانا مودودی کے قد کاٹھ کا آدمی آپ کے ہم عصروں میں نہیں ملتا، نہ کسی کے ساتھ موازنہ ہوسکتا ہے۔ اللہ سب کی مغفرت فرمائے۔

---

[۱] بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تفہیم دین

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

تجدد کی بجائے روایت کی تلقین

مفتی تقی عثمانی صاحب کا خط

ڈاکٹر عمار ناصر کے نام

ا۔ مَیں نے آپ کا مضمون پڑھا اور خالی الذہن ہو کر پڑھا۔ اس میں متعدد امور ایسے ہیں جن میں جمہور اُمت سے ہٹ کر آپ نے اپنی رائے ظاہر فرمائی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا ہر مسئلے کے دلائل پر گفتگو کے بغیر مضمون کا جو مجموعی طرزِ فکر ہے، وہ بندے کو نہایت خطرناک محسوس ہوتا ہے، اِس طرزِ فکر کے ساتھ انسان کسی وقت کسی بھی بڑی گمراہی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ جب ایک مرتبہ کوئی صاحبِ فکر جمہور اُمت کے مسلمات سے آزاد ہو کر اپنی راہ الگ اختیار کر لیتا ہے اور یہ تصور کر لیتا ہے کہ وہ اِن مسلمات کے بارے میں پہلی بار اصابتِ فکر کے ساتھ غور کر رہا ہے، اور چودہ صدیوں میں علمائے امت اُس اندازِ فکر سے محروم رہے ہیں، تو اُس کے اوپر کوئی روک باقی نہیں رہتی۔

ماضی میں یہی طرزِ فکر نہ جانے کتنی گمراہیاں پیدا کر چکا ہے، طٰہٰ حسین سے لے کر سرسید تک اور وحید الدین خان صاحب سے لے کر جاوید غامدی صاحب تک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

اپنے اپنے وقت میں اِس قسم کے طرزِ فکر نے دلائل کا زور بھی باندھا۔ لیکن امتِ اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر رفتہ رفتہ اُسے رد کر کے اِس طرح آگے بڑھ گیا کہ اُس کا ذکر صرف کتابوں میں باقی رہ گیا۔

بالخصوص آج کے دور میں جس طرح کے افکار دین میں تحریف کے درپے ہیں، اس کے سوا سلامتی کا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ انسان علمائے امت کے سوادِ اعظم سے اور جمہور امت کے مسلّمات سے وابستہ رہے۔

بے شک انبیاء کرام علیہم السلام کے سوا کوئی معصوم نہیں، لیکن اِس کا مطلب یہ نہ ہونا

چاہیے کہ انسان جمہور علماء امت کے مقابلے میں خود کو معصوم سمجھنے لگے اور یہ سمجھے کہ اُن سب سے بیک وقت غلطی ہوئی ہے، مجھ سے نہیں۔ لہٰذا میں آپ سے اپنا بھتیجا ہونے کے ناطے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اِس طرزِ فکر سے اپنے آپ کو بچائیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے، انہیں جمہور امت کے دائرے میں رہتے ہوئے خدمتِ دین کے لیے استعمال کا بہت بڑا میدان موجود ہے، اسی میدان میں اس کو استعمال فرمائیں۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جن مسائل پر آپ نے اپنی ''اختلافی آراء'' کا اظہار فرمایا ہے، ان کے بارے میں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا آپ پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ آپ ان مسائل پر اپنی اختلافی آراء کو ظاہر اور شائع کریں؟ نیز یہ کہ اِن افکار کی اشاعت سے فائدہ کیا حاصل ہوا؟ کیا اِس پر کوئی عملی مسئلہ موقوف تھا جو اِن کی اشاعت سے حل ہوگیا؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے نتیجے میں ایک فکری انتشار اور ردّ وقدح کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا جس نے تفریقِ امت کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی، اگر آپ اِن افکار کے حامل تھے بھی، تو اِن کی اشاعت نہ کرتے تو کیا ہوتا؟ مثلاً: اگر رجم یا ارتداد کی سزا کے بارے میں آپ اپنا موقف شائع نہ فرماتے تو کیا نقصان ہو جاتا؟

۳۔ آپ کا تعلق ایک ایسے متصلب گھرانے سے ہے جس نے ہمیشہ جمہور امت کے اتباع کو اپنا شعار قرار دیا ہے، آپ کے جدِّ امجد قدس سرہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اور آپ کے والد گرامی کو میں امت کی قیمتی متاع سمجھتا ہوں، اور اُن کی شخصیت کے متنازع بننے کو امت کا عظیم نقصان، آپ کے اِس قسم کے اُفکار کی وجہ سے وہ جس آزمائش میں مبتلا ہو گئے ہیں، وہ کم از کم میرے لیے شدید تشویش کا باعث ہے، انہوں نے ہمیشہ جمہور امت کی نمائندگی فرمائی ہے، اور اب بھی وہ جمہور امت سے شذوذ کے حق میں نہیں ہو سکتے۔

لیکن آپ کی وجہ سے لوگوں کو انہیں نشانہ بنانے کا موقع مل رہا ہے۔

اِن حالات میں بندہ کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ آپ اولاً تو یہ اعلان فرمادیں کہ: ''میں نے جو کچھ لکھا، یا جو آراء ظاہر کیں، وہ محض احتمال یا تجویز کے طور پر برائے نقد وتبصرہ ظاہر کی

تھیں، لیکن میں ان تمام مسائل میں جن میں میں نے جمہور سے ہٹ کر کوئی رائے ظاہر کی ہے، جمہور کے قول کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور مجھے اپنی رائے پر کوئی جزم یا اصرار نہیں ہے، بلکہ جمہور کے مقابلے میں اسے متہم سمجھتا ہوں۔''

مجھے احساس ہے کہ انسان جس راستے پر سالہا سال چلتا رہا ہو، اس سے یک لخت منہ موڑ لینا نفس پر بہت بھاری معلوم ہوتا ہے، لیکن یہی انسان کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ اس بھاری بوجھ کو اٹھانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

اور اگر آپ کو آپ کو اِس اقدام میں پھر بھی تأمل ہو، تو میری مؤدبانہ درخواست یہ ہے کہ براہِ کرم آپ اپنے افکار کے لیے کوئی دوسرا پلیٹ فارم استعمال کرلیں۔ اور اپنی آراء کو اپنے والد گرامی سے ملتبس ہونے سے ہر قیمت پر بچائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن سے بہت کام لیا ہے، اُن پر اعتراضات کی اصل وجہ آپ بنے ہیں، ورنہ کسی کو اُن پر انگشت نمائی کی جرأت نہ ہوتی، اُن کی شخصیت کا تحفظ اور اُس پر اعتماد کا تحفظ دوسری تمام مصلحتوں اور بالخصوص بے فائدہ آراءِ شاذہ کی نشر واشاعت پر بدرجہا فوقیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں بایں فیوض سلامت رکھیں۔

ایک بات آپ سے براہِ راست پوچھنا بہتر ہے، اور وہ یہ کہ جناب جاوید غامدی صاحب کے اس اظہار کے بعد کہ: ''اخبارِ احاد سے دین میں کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔'' کیا آپ اُن کے طرزِ فکر اور اُن کے اجتہادات کو بھی اجتہادی اختلاف کے دائرے میں سمجھتے ہیں؟ اور اُن سے تلمذ پر مطمئن ہیں؟

یہ چند منتشر خیالات انتہائی دردمندی کے ساتھ اِس اُمید پر پیش کر رہا ہوں کہ آپ اِن پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ گواہ ہیں کہ مذکورہ بالا تحریر کا منشا "الدین النصیحة" ہے، اور اِس کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خاص توفیق سے نوازیں۔

محمد تقی عثمانی

۲۰/شعبان ۱۴۳۵ھ/ ۲۹/جون ۲۰۱۳ء

اسلام اور پاکستان/انتخابات ۲۰۲۴ء پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی سیاسی جماعتوں کو ووٹ کیوں نہیں ملتے؟

حسبِ سابق انتخابات ۲۰۲۴ء میں عوام نے دینی سیاسی جماعتوں کو زیادہ ووٹ نہیں دیے اور ان کی نیشنل اور صوبائی اسمبلیوں میں تعداد مزید کم ہوگئی ہے۔ جمعیت علماء اسلام (ف) کے سابقہ اسمبلی میں ۱۳ ارکان تھے اس دفعہ ۴ منتخب ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی کا پچھلی اسمبلی میں ایک آدمی تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔ تحریک لبیک/ جمعیت علماء پاکستان کا ایک آدمی بھی نیشنل اسمبلی میں نہیں پہنچ سکا۔ یہی حال اہل حدیث جماعتوں کا ہے۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی ان کی تعداد کم ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۸ء میں البرہان نے جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتوں کی شکست کے اسباب پر خصوصی نمبر شائع کیے تھے، اس دفعہ شاید اس کی بھی نوبت نہ آسکے کہ دینی جماعتوں کی شکست ایک متوقع یا معمول کا عمل بن چکا، اب اس میں حیرانی یا خبریت کا کوئی پہلو نہیں رہا۔ بہرحال دینی سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں ووٹ نہ ملنے کے اسباب داخلی بھی ہیں اور خارجی بھی، جو یہ ہیں:

داخلی اسباب

۱۔ عوام کی دین سے دوری
۲۔ دینی عناصر کا عوام کی اصلاح وتربیت نہ کرنا
۳۔ خواص کی تعلیم وتربیت کا فقدان
۴۔ دینی سیاسی جماعتوں کا مسلک پرستی پر مبنی ہونا
۵۔ دینی سیاسی جماعتوں میں باہم افتراق وانتشار
۶۔ دینی سیاسی جماعتوں کا عوامی خدمت کے کام نہ کرنا

خارجی اسباب

۱۔ بین الاقوامی طاقتوں کا کردار
۲۔ حکمران طبقات کی سوچ وعمل

اب ہم ان نکات کی کچھ تفصیل عرض کریں گے:

داخلی اسباب

ا۔عوام کی دین سے دوری

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیام پاکستان سے لے کر آج تک عوام میں دین سے دوری بتدریج بڑھی ہے۔ پاکستانی معاشرہ بلاشبہ اخلاقی بحران کا شکار ہے۔اس کے بڑے اسباب میں سے والدین اور اساتذہ کا بچوں کی تربیت سے غافل ہونا،مغرب کی الحادی تہذیب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی ہے، مادہ پرستی کا فروغ ہے۔عوام کی مساجد سے عدم وابستگی ، دینی مدارس کا عوام کو انگیج نہ کرنا ، میڈیا کے بُرے اثرات ، جدید تعلیم میں مذہبی تعلیم وتربیت کا فقدان، خانقاہی نظام اور طریقِ تزکیہ کا غیر اسلامی اور غیر مؤثر ہوجانا بھی اس کا سبب ہے۔ عوام میں سیکولرزم (یعنی نماز ، روزہ، تراویح وغیرہ کی کچھ پابندی کر لینا لیکن ملازمت،تجارت اور معاشرے وریاست کے اجتماعی امور میں دینی احکام پر عمل نہ کرنا) اور لبرلزم (یعنی دینی اقدار پر پابندی کو سنجیدہ نہ لینا) جیسے رجحانات کا فروغ پانا ہے۔ان سب نکات کی تشریح کی جاسکتی ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ملک کے پڑھے لکھے اور باشعور عناصر ان باتوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

۲۔دینی عناصر کا عوام کی اصلاح وتربیت نہ کرنا

دینی سیاسی جماعتوں کے بعض افراد کی طرف سے، الیکشن میں دینی سیاسی جماعتوں کی ناکامی کے بعد،اس طرح کے تبصرے بھی سننے کو ملے ہیں کہ عوام میں دینی شعور ہی نہیں،عوام کو دینی مفاد کا احساس ہی نہیں، مادہ پرستی عام ہے،لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں،جیسی روح ویسے فرشتے اور بعض دینی لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بری سیاسی قیادت عوام کے برے اعمال کا نتیجہ ہے، اللہ کا مسلط کردہ عذاب ہے۔عوام تو کالانعام ہیں اور الناس علی دین ملوکھم.... وغیرہ وغیرہ۔

بلاشبہ ان باتوں میں جزوی صداقت موجود ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ عوام کی اس حالت یا اس رویے اور رجحان کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر حکومت عوام کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام نہ کرے (اگرچہ اسے کرنا چاہیے) تو کیا علماء کرام اور دینی عناصر کی یہ ذمہ داری نہیں کہ

وہ عوام کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں؟ ہمارے بچپن میں مساجد جمعہ کی نماز کے علاوہ بھی ممتاز علماء کی طرف سے وعظ ونصیحت اور دینی جلسوں کا اہتمام کرتی تھیں لیکن اب وہ رجحان بتدریج دم توڑ چکا ہے۔ دینی مدارس میں عصر کے بعد اپنی کلاسیں نہیں ہوتیں اور ان میں عوام کے لیے دینی شارٹ کورسز اور لانگ کورسز رکھے جاسکتے ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں کالج یونیورسٹیوں کے طلبہ وطالبات کے لیے دینی تعلیمی سرگرمیاں رکھی جاسکتی ہیں لیکن دینی مدارس کی اس طرف توجہ ہی نہیں ہے۔

پھر دینی سیاسی جماعتوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ صرف انتخابی جدوجہد ہی کے دوران عوام سے رابطہ کرنا کافی نہیں۔ اگر انہیں عوام کے ووٹ درکار ہیں تو انہیں عوام سے مستقل رابطہ رکھنا چاہیے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے، ان کو اپنا ہم خیال بنانا چاہیے، ان کو انگیج کرنا چاہیے۔ ان کے مسائل حل کرنے میں ان کی مدد کرنا چاہیے، ان کی مشکلات میں ان کا ساتھ دینا چاہیے، خدمتِ خلق کا کام کرنا چاہیے۔ غرض خدمت، حکمت اور سلیقے سے عوام کی تربیت کرنی چاہیے۔

۳۔ خواص کی تعلیم وتربیت

عوام اور معاشرے کا ایک حصہ وہ طبقہ بھی ہے جسے ہم اشرافیہ یا اسٹیبلشمنٹ یا حکمران طبقات کہتے ہیں (جیسے انتظامیہ، عدلیہ، فوج، بیوروکریسی وغیرہ)۔ ظاہر ہے یہ لوگ پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں، کافر اور غیر ملکی نہیں ہیں۔ کیا ان کی دینی تعلیم وتربیت علماء اور دینی عناصر کی ذمہ داری نہیں؟ پچھلی صدیوں میں علماء وصوفیاء اس فریضے کو بخوبی ادا کرتے تھے اور اسی وجہ سے وہ حکمرانوں کے حریف کے طور پر سامنے نہیں آتے تھے اور نہ حصولِ اقتدار میں ان سے مسابقت کرتے تھے بلکہ ان کی دینی تعلیم وتربیت اور دعوت واصلاح کا کام کرتے تھے بلکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے تو اس بات کو بطور حکمتِ عملی سیاسی تبدیلی کے لیے استعمال کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ کیا ہماری دینی سیاسی جماعتیں اور علماء کرام ان خطوط پر کام نہیں کرسکتے؟

ہم نے محترم بے نظیر بھٹو کا یہ واقعہ اخبار میں پڑھا تھا جب یہ پیش آیا تھا کہ وہ کہیں تقریر کررہی تھیں کہ قریبی مسجد سے اذان کی آواز آنے لگی۔ سٹیج سیکرٹری نے ان کے پاس جا کر

سرگوشی کی کہ اگر وہ اذان کا وقفہ کردیں تو اس سے مسلمان عوام پر اچھا تاثر پڑے گا چنانچہ محترمہ نے سپیکر میں کہا کہ ’’اذان بج رہی ہے، مَیں اس کے بعد تقریر جاری رکھوں گی‘‘۔ وہ چونکہ بچپن میں کانونٹ (عیسائی مشنری سکول) میں پڑھی تھیں اور گریجوایشن انہوں نے آکسفورڈ سے کی تھی۔تو ہمارا اپنا مشاہدہ یہ ہے کہ برطانوی شہروں میں ہر وقت چرچ کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں تو انہوں نے کہا کہ ’’اذان بج رہی ہے‘‘ تو وہ سمجھیں کہ شاید اذان بھی ریکارڈڈ ہوتی ہے اور بجتی ہے۔ہم نے اُس وقت بھی اس واقعے پر یہ تبصرہ کیا تھا اور آج بھی کرتے ہیں کہ یہ ہمارے دینی عناصر اور علماء کرام کی کمزوری اور غفلت ہے کہ انہوں نے اپنی ایلیٹ کلاس کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام نہیں کیا۔ انہیں چند سکول کالج کانونٹ اور ایچی سن کے مقابلے کے بنانے چاہئیں تھے جن میں ایلیٹ کلاس کے بچے پڑھتے، جنہوں نے بڑے ہوکر معاشرے میں فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے تو یہ چیز ان کے کام آتی۔اسی طرح وکلاء اور عدلیہ کا معاملہ ہے۔کیا ہمارے علماء کرام اور دینی عناصر نے ملک میں ایسے لاء کالج قائم کیے ہیں جن میں جدید قانون تعلیم کے ساتھ قرآن وسنت، فقہ، عربی زبان کی تعلیم دی جاتی۔اگر ایسا ہوتا تو آج وکیلوں اور عدلیہ کے ججز کی ایک معقول تعداد ان کے تیار کردہ آدمیوں کی ہوتی۔یہی کام CSP افسران یا مقابلے کے امتحان کی تیاری کی اکیڈمیاں قائم کرکے بھی کیا جاسکتا ہے۔جب علماء کرام اور دینی مدارس نے یہ کام کیا نہیں تو وہ گلہ کرنے کے حق دار کیسے ہوسکتے ہیں؟

۴۔دینی سیاسی جماعتوں کی مسلک پرستی

سامراج نے مسلمانوں کو ہمیشہ سے تقسیم کرنے کی سازش کی ہے لہٰذا مختلف مسالک تعصب کا شکار ہوگئے۔ پاکستان میں ریاست نے جان بوجھ کر ہر مسلک کو اپنا تعلیمی وفاق بنانے کی اجازت دی ہے۔ ملک میں کوئی مسجد نہیں بن سکتی جب تک اس کا مسلک ذکر نہ کیا جائے۔ ریاست چاہتی ہے کہ مولوی آپس میں لڑتے رہیں تاکہ سیکولر سیاسی عناصر آرام سے حکومت چلاتے رہیں۔ اس غرض کے لیے دینی جماعتوں میں فرقہ واریت اور مسلک پرستی کو پھیلایا اور مستحکم کیا جاتا ہے، انہیں انتخابات میں آپس میں لڑایا جاتا ہے تاکہ اسلامی ووٹ کہیں اکٹھا نہ ہوجائے۔ اسی لیے مسلک کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی رجسٹریشن کی اجازت دی جاتی

اور انہیں کام کرنے کا کھلا موقع دیا جاتا ہے۔

یہ تو ریاست وحکومت کا کردار ہے۔ سوال یہ ہے کہ علماء کرام اس سازش کو کیوں نہیں سمجھتے؟ وہ کیوں فرقہ واریت اور مسلک پرستی پر اصرار کرتے ہیں۔ دینی علمی ابحاث کو عوام میں لے کر جاتے ہیں اور انہوں نے مساجد ومدارس کو فرقوں کی آماجگاہ بنا رکھا ہے۔ کسی دینی سیاسی قائد کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر وہ ایک مسلک کے علمبردار کے طور پر الیکشن میں کھڑا ہوگا تو دوسرے مسالک کے لوگ اسے ووٹ نہیں دیں گے اور یوں گویا مسلک کی بنیاد پر کوئی بھی شخص اقتدار میں نہیں آسکتا۔ اس کے باوجود وہ متحد نہیں ہوتے، آپس میں اتفاق نہیں کرتے اور متحد ہو کر الیکشن نہیں لڑتے یہاں تک کہ وہ سیٹ ایڈجسٹمنٹ پر بھی راضی نہیں ہوتے۔

۵۔ دینی سیاسی جماعتوں میں باہمی افتراق وانتشار

سطور بالا میں ہم نے دینی سیاسی جماعتوں میں باہمی انتشار کے کچھ اہم اسباب پر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ علماء کرام اور دینی سیاسی جماعتوں کی سمجھ میں کیوں یہ بات نہیں آتی کہ دینی سیاسی جماعتوں کے مابین مشترکہ نکات بہت زیادہ ہیں اور اختلافات اکثر فروعی اور اجتہادی نوعیت کے ہیں تو وہ مشترکات پر اکٹھے کیوں نہیں ہوتے؟ مثلاً ایک بنیادی مسئلہ ہے پاکستان میں نفاذِ شریعت تو اس پر ان دینی جماعتوں میں کیا اختلاف ہے؟ بظاہر کوئی اختلاف نہیں تو کیا وجہ ہے کہ یہ نفاذ شریعت کے مسئلے پر اکٹھے نہیں ہوتے؟ خدا، رسول، آخرت، قرآن جیسے بنیادی عقائد؛ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج جیسی عبادات؛ اخلاقِ حسنہ کے بہتر ہونے اور رذائل سے بچنے پر ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ معاملات کے اساسی پہلوؤں پر بھی ان میں کوئی خاص اختلاف نہیں تو یہ اکٹھے کیوں نہیں ہوتے؟

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سیکولر جماعتوں کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ دینی سیاسی جماعتوں نے اکثر بحالئ جمہوریت کی سرگرمیوں میں سیکولر سیاسی جماعتوں کا ساتھ دیا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب تو جس کسی کی بھی حکومت ہو، اس سے مل جاتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں خواہ مسلم لیگ ہو یا پیپلز پارٹی یا کوئی جرنیل ہو لیکن وہ دوسری دینی سیاسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد کرنے پر تیار نہیں ہوتے؟

اچھا! انہیں یہ بھی پتا ہے کہ باہم مل جانے کے بہت سے فائدے ہیں۔ جب وہ اکٹھے ہو گئے تو بھٹو صاحب جیسے سوشلسٹ، سیکولر اور لبرل آدمی کو ختم نبوت میں ان کا مطالبہ ماننا پڑا۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ آج بھی جس مسئلے پر اکٹھے ہو جائیں تو کوئی حکومت ان کی مزاحمت نہیں کر سکتی لیکن یہ سب جاننے کے باوجود وہ اکٹھے نہیں ہوتے، تو ہم اس کا دوش کس کو دیں؟ سوائے خود ان کے۔

۶۔ دینی سیاسی جماعتوں کا عوامی خدمت کے کام نہ کرنا

اگرچہ مغربی جمہوریت میں ایسا نہیں ہوتا جس کو اسلام کے ساتھ ملا کر ہمارے دینی عناصر نے اسلامی جمہوریت بنائی ہوئی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہی مروج ہے کہ آدمی خواہ نیشنل اسمبلی کا امیدوار ہو خواہ صوبائی کا، کہ عوام ان سے نالیاں اور سڑکیں بنوانے کا کام لیتے ہیں۔ یہ رواج ہے کہ وہ تھانے کچہری میں عوام کے کام آتے ہیں، ملازمت دلوانے اور تبادلے کروانے میں ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کاموں میں سے جو جائز ہوں انہیں کرانے میں شرعاً کوئی گناہ بھی نہیں بلکہ اسلام خدمتِ خلق کی تلقین کرتا ہے لیکن ہمارے دینی لوگ عوام سے ووٹ تو لینا چاہتے ہیں لیکن ان کاموں میں ان کی مدد نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں ان کی پذیرائی نہیں ہوتی اور عوام انہیں ووٹ نہیں دینا چاہتے۔ سیاستدان جس طرح ان کے کام آتے ہیں، علماء اس طرح ان کے روزمرہ کے کاموں میں ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ ایم ایم اے کو صوبہ سرحد میں حکومت ملی لیکن وہ کوئی خاص پرفارمنس نہ دے سکی۔ اسلامی حوالے سے بھی وہ کوئی خاص پیش رفت نہ کر سکی۔ یوں عوام سمجھتے ہیں کہ علماء ووٹ کے حق دار نہیں۔ وہ ان کو عزت تو دیتے ہیں، ان کا احترام تو کرتے ہیں لیکن انہیں ووٹ نہیں دیتے اور بطور حکمران ان کے کردار کو مؤثر اور مفید نہیں سمجھتے۔

خارجی اسباب

۱۔ بین الاقوامی طاقتوں کا کردار

اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف مغربی فکر و تہذیب اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے بلکہ اس کے علمبردار مغربی ممالک اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ انہوں نے ماضی میں مسلمان ملکوں پر حملہ کر کے ان کو زیر کیا، انہیں لوٹا، کچلا، تباہ کیا اور انہیں ہمیشہ کے لیے غلام رکھنے کی پلاننگ کی۔ ذہن سازی کے ذرائع سمیت مسلم ممالک کے ریاستی ڈھانچے کو گرا کر اس کی جگہ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق ان کی تشکیلِ نو کی گئی اور جب دوسری جنگ عظیم کے بعد

انہیں مسلم ممالک کو آزادی (؟) دینا پڑی تو انہوں نے اس کی کامیاب پلاننگ کی کہ اقتدار ان کے تیار کردہ اُن مسلم رہنماؤں کے ہاتھ آئے جو ان کے نظریات ومفادات کا تحفظ کرتے رہیں۔ اس کے باوجود چند مسلم ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے پہلے عراق کو کچلا، پھر افغانستان کا تورا بورا بنایا اور پھر لیبیا کو بھی تباہ وبرباد کر دیا۔ شام اور یمن اس وقت تباہ کیے جا رہے ہیں اور پاکستان، ایران، ترکی، سعودی عرب وغیرہ پر شدید حربی، معاشی اور تہذیبی دباؤ موجود ہے۔ ان حالات میں مغربی ممالک خصوصاً ان کی خفیہ ایجنسیاں مسلم ممالک میں اپنی مرضی کے حکمران لانے اور دینی جماعتوں کو کامیاب نہ ہونے دینے جیسے کاموں کے لیے مستقل سازشیں کرتی رہتی ہیں۔

۲۔ حکمران طبقات کی فکر وعمل

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا کہ طاقتور مغربی ممالک مسلم ممالک پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے حکومت کرتے ہیں اور حکومتی اکھاڑ پچھاڑ میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے مسلم ممالک میں اپنی پالیسیاں نافذ کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ فوجی جرنیلوں، بادشاہوں، سول آمروں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ گماشتہ حکمران اور ان کی خفیہ ایجنسیاں پوری پلاننگ کرتی ہیں کہ دینی سیاسی جماعتوں کو اوپر نہ آنے دیا جائے۔ چنانچہ جنرل مشرف کے زمانے میں ایم ایم اے کی پوزیشن ذرا مضبوط ہوئی اور مولانا فضل الرحمٰن نے وزارت عظمیٰ کا الیکشن لڑنا چاہا تو جنرل مشرف نے انہیں صاف کہا کہ امریکہ ایسا نہیں چاہتا لہٰذا وہ کھڑے نہ ہوں۔ وہ کھڑے ہو گئے تو انہیں ہرا دیا گیا۔ اسی طرح اگر کہیں کوئی دینی یا ایسی سیاسی جماعت برسر اقتدار آ جائے جو ان کے حق میں کٹھ پتلی کا کردار ادا کرنے پر راضی نہ ہو تو بین الاقوامی طاقتیں اسی ملک کی فوج کے ذریعے اسے اقتدار سے محروم کر دیتی ہیں۔ الجزائر، فلسطین اور مصر میں یہ ہو چکا۔ ترکی میں اردوان کے خلاف بغاوت ہوئی، پاکستان میں عمران خان کی حکومت گرا دی گئی وغیرہ۔ پاکستان میں ضیاء الحق اور بھٹو کو مروا دیا گیا۔ اسی طرح پاکستان کے حالیہ انتخابات (۲۰۲۴ء) میں بھی دینی جماعتوں اور عمران خان کی تحریک انصاف کو الیکشن میں جھرلو پھیر کر ہرا دیا گیا۔

ممکن ہے عوام کے علماء کو ووٹ نہ دینے کے دوسرے عوامل بھی ہوں تاہم ہماری سمجھ میں جو آیا، ہم نے عرض کر دیا۔ امید ہے کہ اس سے نفس مسئلہ کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ مدد ضرور ملے گی، ان شاء اللہ۔

اسلام اور پاکستان/انتخابات ۲۰۲۴ء پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

دینی سیاسی جماعتوں کے لیے متبادل پروگرام
مزید وضاحت

انتخابات میں دینی سیاسی جماعتوں کے کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے یہ سوال علمی حلقوں کے سامنے آیا کہ کیا ان جماعتوں کے سامنے جمہوری انتخابی جدوجہد کے سوا کوئی اور منہج بھی ممکن ہے؟ ہم نے اس کے جواب میں ’’سافٹ انقلاب بذریعہ کلّی اصلاح‘‘ کا منہج پیش کیا۔ اس پر جزوی اصلاح کی حامل تبلیغی جماعت، دعوتِ اسلامی اور دینی مدارس نے تو کسی ردّعمل کا اظہار ابھی تک نہیں کیا البتہ مولانا مودودی کی اقامت دین کی فکر کی حامل جماعتوں (جماعتِ اسلامی، تنظیمِ اسلامی اور تحریک اسلامی) کے کارکنوں نے اس پر اعتراضات اٹھائے ہیں کہ آپ تو تزکیہ و اصلاح کی بات کر رہے ہیں اور اس طریقے سے تو پاکستان میں اسلامی انقلاب آ ہی نہیں سکتا، ایسا کبھی ہوا ہی نہیں، آپ کی بات میں کوئی وزن نہیں!

دیکھیے! ہم نے کہا تھا کہ نبی کریم ﷺ جو دنیا کا سب سے بڑا انقلاب لائے تھے، اس میں یہی منہج اختیار کیا گیا تھا۔ پھر ہم نے مولانا مودودی کی چار تقریریں/تحریریں پیش کی تھیں جن کی رو سے ہمارے مؤقف کی حمایت ہوتی تھی، لیکن ان احباب نے انقلاب محمدی پر غور کرنے اور مولانا کی تحریریں پڑھنے کو ضروری نہیں سمجھا اور ہمارے مطالبے کو سرسری لیتے ہوئے اس لحاظ سے ناکافی قرار دیا کہ اس میں سیاسی جدوجہد کو اہمیت ہی نہیں دی گئی۔

ہم دوبارہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری تجویز میں سیاسی جدوجہد اور سیاسی سرگرمیوں کی گنجائش بالکل موجود ہے۔ ہم نے جو کہا تھا اس کی تلخیص دوبارہ پیش خدمت ہے:

۱۔ کرنے کا بنیادی کام تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس (’’یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ‘‘) ہے تاکہ صحیح تعلیم (عصری تعلیم، دینی مدارس، دعوت، میڈیا کی اصلاح اور اسلامی تشکیلِ نو کے بعد) اور تزکیۂ نفس (صحیح تعلیم کے نتیجے میں تربیت وتزکیہ کے ذریعے افراد کی تعمیرِ سیرت اور تعمیرِ کردار اسلامی خطوط پر کر کے ایسے افراد تیار کیے جائیں جو

اسلام کے جامع اور متوازن تصور کے حامل ہوں اور نہ صرف ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کریں بلکہ معاشرے اور ریاست کو اسلامی بنانا بھی ان کے پیشِ نظر ہو۔ اور یہ بالکل مشکل نہیں کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی افراد ہی چلاتے ہیں۔

۲۔ صحیح تعلیم وتزکیہ کے بعد یہ افراد زندگی کے سارے شعبوں میں کام کریں اور ان شعبوں کی اصلاح وتعمیرِ نو صحیح اسلامی خطوط پر کریں۔

۳۔ سیاست کے شعبے میں جو افراد کام کریں، انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مغربی جمہوریت جو مغرب کی الحادی تہذیب کے سیاسی نظام کا جزوِ اعظم ہے، اس میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' نہیں بنایا جا سکتا اور بنا بھی لیا جائے تو اس کے ذریعے ملک میں اسلام نہیں آ سکتا، دین کو غالب نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کے ذریعے لوگ اسلام کے قریب آ سکتے ہیں بلکہ مغربی فکر وتہذیب کے اصول ہی غالب آئیں گے جیسے سیکولرزم، لبرل ازم اور مادہ پرستی وغیرہ۔ اور سیکولر سیاسی جماعتیں ہی غالب آئیں گی جو عملاً اسلام کا نفاذ نہیں چاہتیں۔

۴۔ ان حالات میں سیاسی سرگرمیاں اس لیے تو جاری رکھی جا سکتی ہیں کہ ملک میں سرکاری سطح پر فساد و بگاڑ اور بے دینی کے فروغ کو روکا جائے اور مغربی تہذیب کے نظریات کے نفاذ کو روکا جائے یا جو اسلامی قوانین بن چکے ہیں، ان پر عمل کا مطالبہ کیا جائے اور ان کے خاتمے کی کوششوں کو ناکام بنایا جائے، تاہم یہ ذہن میں رکھا جائے کہ:

* اس طرح کی سیاسی جدوجہد سے ملک میں اسلام کا غلبہ نہیں ہو سکتا جیسا کہ دینی جماعتوں کا ۷۷ سالہ طویل تجربہ اس کا شاہد ہے لہٰذا یہ جدوجہد غیر انتخابی ہونی چاہیے۔

* اصل اور بنیادی کام صحیح اسلامی خطوط پر افرادی تعمیرِ سیرت وکردار کا ہے جو تعلیم وتزکیہ کے صحیح منہج کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔

۳۔ تعلیم وتزکیہ کا یہ کام اس طرح کیا جائے کہ اس سے فیض یاب ہونے والے افراد نہ صرف اپنی ذاتی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کریں بلکہ معاشرے اور ریاست کو بھی اسلامی بنانے کی جدوجہد کریں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۵)

اسلام اور پاکستان / انتخابات ۲۰۲۴ء پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

جماعتِ اسلامی کے اہلِ علم و دانش کی خدمت میں

جماعت سیاسی انتخابی پالیسی پر نظر ثانی کیوں نہیں کرتی؟

* جماعت کے ایک بہی خواہ کی حیثیت سے ہم یہ تحریر جماعت کے اہلِ علم و دانش، اس کی شوریٰ اور اہلِ حلّ وعقد کے غور وفکر کے لیے لکھ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ وہ توجہ فرمائیں گے۔

* حقائق یہ ہیں کہ پاکستان میں ماضی میں جتنے بھی انتخابات ہوئے جماعت نے ان میں حصہ لیا لیکن وہ ہمیشہ ناکام رہی۔ آہستہ آہستہ اس کا ووٹ بنک سکڑتا گیا۔ ۲۰۲۴ء کے انتخابات میں بھی اسے ووٹ نہیں ملے۔ اس پر امیر جماعت اسلامی جناب سراج الحق صاحب نے اسے اپنی کارکردگی سے جوڑتے ہوئے جماعت کی امارت سے استعفیٰ بھی دے دیا ہے۔ ہماری رائے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ امیرِ جماعت سراج الحق صاحب ہوں یا کوئی دوسرا شخص۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر انتخاب میں ناکامی کے باوجود جماعت اپنی پالیسی پر نظر ثانی کیوں نہیں کرتی؟ یہاں تک کہ وہ اپنی ناکامی کا تجزیہ بھی نہیں کرتی کہ اسے لوگ کیوں ووٹ نہیں دیتے؟۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ۱۹۵۱ء کے پہلے انتخابات میں حصہ لینے پر جو جائزہ کمیٹی بنی تھی، اس کے نتیجے میں جماعت بحران کا شکار ہوگئی جس کے نتیجے میں بالآخر جماعت کے ان افراد کو جو دعوت و اصلاح کی اولیت کے قائل تھے جماعت چھوڑنی پڑی یا انہیں نکال دیا گیا اور مولانا مودودیؒ کے ساتھ وہ لوگ رہ گئے جو اس وقت اکثریت میں تھے اور جو مولانا کی رائے کے مطابق پاکستان میں سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقامتِ دین اور انقلابِ امامت کا کام کرنا چاہتے تھے۔ ۲۰۱۸ء کے انتخابات میں شکست کے بعد جماعت نے ایک جائزہ کمشن بنایا تھا لیکن بعد میں پتا نہیں چلا کہ اس نے کیا تجاویز پیش کیں یا ان پر کتنا عمل ہوا؟ اس میں ہم نے بھی کچھ گزارشات کمشن کے سامنے رکھی تھیں اور جماعت کے ہمدرد اہلِ نظر میں سے بہت سے دوسرے لوگوں کے خیالات بھی ہم نے البرہان کے خصوصی نمبر میں شائع کیے تھے۔ ہم نے وہ خصوصی نمبر جماعت کی قیادت کو بھیجا تھا۔ تاہم ہمارے علم میں نہیں

کہ ان گزارشات پر کسی نے غور کیا یا نہیں۔ ہم چونکہ جماعت کے خیر خواہ ہیں اور اسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں لہٰذا دوبارہ اس کے اہلِ علم و دانش، شوریٰ اور اہلِ حلّ وعقد کے سامنے اپنی تجاویز رکھ رہے ہیں، اس توقع کے ساتھ کہ وہ ان پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں جماعت کی شکست کے بعد ہم نے اور جماعت کے ہمدرد اہل علم وفکر نے جماعت کی خدمت میں تجاویز پیش کی تھیں جو البرہان کے خصوصی نمبر اور بعد میں کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوگئی تھیں۔ جو صاحب انہیں دیکھنا چاہیں وہ ہم سے بلا معاوضہ طلب کرسکتے ہیں یا البرہان کی ویب سائٹ سے آن لائن پڑھ سکتے ہیں۔[۱]

* ہم تجاویز پیش کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ جماعت اور اس کی قیادت اپنی پالیسی اور لائحہ عمل پر نظر ثانی کرنے کو کیوں تیار نہیں ہوتی؟ جماعت کی پالیسی میں کیا تبدیلیاں کی جائیں؟ یہ تو بعد کی بات ہے، سوچنے کی پہلی بات یہ ہے کہ جماعت اپنی پالیسی پر غور وفکر کرنے اور اسے تبدیل کرنے پر تیار کیوں نہیں ہوتی؟

* ہمارے مطالعے کی حد تک اس کی وجہ مولانا مودودیؒ کے تین اہم نظریات ہیں:

۱۔ مسلم زوال سے نکلنے اور مغربی فکر وتہذیب کے غلبے کے ردّ عمل میں مولانا مودودی نے یہ رائے قائم کی کہ مسلمانوں کی بھی عظیم سلطنت ہونی چاہیے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔ اس کے لیے انہوں نے دینی نصوص کی ایسی تشریح کی جس سے دین کا بنیادی ہدف اور مسلمانوں کا نصب العین دینی مقاصد کے لیے حصولِ اقتدار اور انقلابِ امامت ہو۔[۲] اس اسلامی ریاست کے قیام کے لیے انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو قرآن وسنت سے مستفاد ہے کہ افراد کی تعمیر سیرت کی جائے اور معاشرے کی اصلاح کی جائے جس کے منطقی نتیجے کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آجاتی ہے۔[۳]

۲۔ قیامِ پاکستان کے عہد مولانا نے سمجھا کہ حالات بدل گئے ہیں تو انہوں نے قیامِ

---

[۱] www.alburhaan.pk

[۲] تفصیل کے لیے دیکھیے قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، تجدید واحیائے دین، اسلامی نظام زندگی وغیرہ

[۳] پمفلٹ 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟' ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں مولانا مودودیؒ کی تقریر، مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

ریاست اسلامی کے طریقِ کار کو بدل دیا اور سیاسی جدوجہد سے پاکستان کو صحیح اسلامی ریاست بنانے کا طریقہ اختیار کر لیا۔ (۱)

۳۔ پاکستان کو صحیح اسلامی ریاست بنانے کے لیے مولانا کی رائے میں چونکہ سیاسی جدوجہد ناگزیر تھی اور پاکستان میں مغربی جمہوریت رائج تھی جو خلافِ اسلام تھی تو مولانا نے اس کا حل یہ سوچا کہ اس جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے قابلِ قبول بنا لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے 'تھیوڈیموکریسی' یا 'اسلامی جمہوریت' کی اصطلاح وضع کر لی اور اس تناظر میں سیاسی جدوجہد کر کے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی جدوجہد شروع کر دی اور یہ کہا کہ اگر ہمیں اس طریقے سے کامیابی مل گئی تو فبہا ورنہ ہم اپنے پہلے طریقے کی طرف لوٹ جائیں گے اور افراد کی تعمیر سیرت اور معاشرے کی اصلاح کے ذریعے نظام کو بدلنے کی کوشش کریں گے۔ (۲)

جماعتی قیادت کے ایک بڑے حصے کو اس سے اتفاق نہیں تھا چنانچہ ۱۹۵۶ء کے ماچھی گوٹھ کے بحران کے نتیجے میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا حکیم محمد اشرف، مولانا عبدالجبار غازی اور دوسرے بڑے لوگ جماعت سے نکل گئے یا نکال دیے گئے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت کی شکست کے بعد مولانا نے اپنی رائے پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کی اور دسمبر ۱۹۷۵ء میں شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جمہوری انتخابات قیامِ نظامِ اسلامی کا واحد طریقہ نہیں ہیں۔ لیکن شوریٰ اس پر مطمئن نہیں ہوئی اور مولانا اس پر خاموش ہو گئے۔ (۳)

* ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مولانا کے یہ نظریات ان کی اجتہادی رائے

---

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء۔ یہ بحث اب مولانا کی کتاب 'اسلامی ریاست' کے آخر میں ص ۷۰۴ پر موجود ہے۔ طبع اسلامک پبلی کیشنز، لاہور

(۲) ایضاً

(۳) دسمبر ۱۹۷۵ء میں شوریٰ سے مولانا کا خطاب۔ اس کی تفصیلات مولانا وصی مظہر ندوی مرحوم (سابق امیر جماعت اسلامی صوبہ سندھ و رکن مرکزی مجلس شوریٰ۔ انہوں نے اس موضوع پر مولانا مودودی سے خط و کتابت بھی کی جو چھپ چکی ہے۔ مولانا نے اس موضوع پر پبلک بیان بھی دیا وہ بھی اسی زمانے میں مجیب الرحمٰن شامی اور الطاف حسن قریشی صاحب کے رسالے ہفت روزہ طاہر (شمارہ ۵/اپریل ۱۹۷۶ء) میں چھپا۔ یہ ساری چیزیں باحوالہ البرہان کے شمارہ ستمبر ۲۰۱۸ء میں طبع ہو چکی ہیں جو جماعت کے ذمہ داران کو بھیجا گیا تھا۔

پر مبنی تھے اور اصولِ فقہ کا معروف قاعدہ ہے کہ حالات کے بدلنے سے حکم شرعی بدل جاتا ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ امام شافعیؒ جب فلسطین سے مصر گئے تو انہوں نے کئی امور میں اپنی رائے بدل لی۔ یا مولانا کی یہ رائے حکمتِ عملی پر مبنی تھی جو نصوص سے استفادے پر مبنی تھی اور ظاہر ہے کہ حکمتِ عملی نص نہیں ہوتی بلکہ نصوص سے استفادے پر مبنی ہوتی ہے اور حالات کے بدلنے سے حکمتِ عملی بدلی جاسکتی ہے۔ چنانچہ خود مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۰ء میں قیامِ حکومت اسلامی کے طریق کار کے بارے میں جو رائے دی تھی اسے ۱۹۴۸ء میں بدل لیا۔ اور ۱۹۴۸ء میں جو رائے قائم کی تھی اسے ۱۹۷۵ء میں بدل لیا لیکن جماعت کے قائدین اس سے متفق نہ ہوئے تو وہ خاموش ہو گئے اور عمر بھر کی جدوجہد سے انہوں نے جو جماعت قائم کی تھی، اس میں خلفشار ڈالنا پسند نہ کیا۔

* ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جماعت کی ۷۷ سالہ جدوجہد کا حاصل یہ ہے کہ بے شمار انتخابات میں حصہ لینے کے بعد اسے یہ تجربہ ہوا ہے کہ اس طریقے سے حقیقی اسلامی ریاست کا قیام اور انقلابِ امامت ممکن نہیں لہٰذا وہ سیاسی انتخابی جدوجہد کی حکمت عملی کو بدل سکتی ہے اور مولانا مودودیؒ کی اس رائے پر عمل کرسکتی ہے جو انہوں نے ۱۹۴۰ء میں قائم کی تھی کہ افراد کی تعمیرِ سیرت اور اصلاحِ معاشرہ کا کام اس وسیع پیمانے پر کیا جائے کہ اس کے نتیجے میں منطقی طور پر اسلامی ریاست وجود میں آجائے۔

اس کی ایک مثال امیرِ جماعت اسلامی ہند سید سعادت الحسینی صاحب کی رائے بھی ہے۔ انہوں نے جماعت اسلامی ہند کے رسالے 'زندگی نو'' میں مضمون لکھا (جو ہم نے اپنے ماہنامہ البرہان میں شائع کیا) [۱] جس میں انہوں نے کہا کہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق مولانا مودودی نے جماعت کی حکمت عملی سیاسی تناظر میں طے کی۔ آج حالات بدل چکے ہیں لہٰذا جماعت کی پالیسی تہذیبی تناظر میں طے کی جانی چاہیے۔ اس کے جواب میں ہم نے مضمون لکھا کہ نئی حکمت عملی ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ پر مبنی ہونی چاہیے کہ یہ براہ راست حکم قرآنی اور اسوۂ رسول پر مبنی ہے اور وقت کا تقاضا بھی ہے کہ اور تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ جب تک فرد کو نہ بدلا جائے، معاشرہ تبدیل نہیں ہوتا (کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے) اور نہ ریاست اسلامی ہوسکتی ہے (کہ ریاست کو بھی افرادِ

---

[۱] ماہنامہ البرہان شمارہ مئی ۲۰۲۰ء

معاشرہ ہی چلاتے ہیں)۔[1]

حاصلِ بحث

تو خلاصہ یہ کہ خود مولانا مودودیؒ کی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت کی پالیسی (یعنی انقلابِ امامت بذریعہ سیاسی جدوجہد اور وہ بھی مغربی جمہوریت سے مستفاد 'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے، بدل دی جائے اور اس کی بنیاد مولانا مودودیؒ کی مندرجہ ذیل تحریروں/تقریروں پر رکھی جائے:

۱۔ ۱۹۴۰ء میں مولانا کی علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر بعنوان 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟'' جس میں انہوں نے کہا کہ قیامِ اسلامی حکومت کا فطری طریقہ یہ ہے کہ پہلے افراد و اصلاحِ معاشرہ کا کام کیا جائے۔ [مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز]

۲۔ ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء میں مولانا کی تحریر جس میں انہوں نے فرمایا کہ اگر اقامتِ دین بذریعہ سیاسی جدوجہد سے ہمیں کامیابی نہ ملی تو ہم اصلاحِ فرد و معاشرہ کے پہلے راستے پر واپس چلے جائیں گے (یہ تحریر مولانا کی کتاب ''اسلامی ریاست'' کے آخر میں (صفحہ ۷۴۰) پر موجود ہے۔

۳۔ ۱۹۷۰ء والے الیکشن میں شکست کے بعد مولانا کا دسمبر ۱۹۷۵ء میں جماعت کی شوریٰ سے خطاب جس میں انہوں نے کہا کہ جمہوری انتخابات اقامتِ دین کا واحد راستہ نہیں ہیں۔

۴۔ ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' جس میں مولانا نے تحریک کے لائحہ عمل میں پہلا نکتہ مخاطبین کی 'تطہیر افکار و تعمیرِ افکار' کو قرار دیا لیکن اس پر ماضی میں زیادہ کام نہیں ہو سکا۔

اور اقامت دین و انقلابِ امامت کا کام عوام کی فکری و عملی تطہیر (یعنی تعمیر سیرت و کردار) اور معاشرے کو جڑ بنیاد سے ٹھیک کرنے کے ذریعے شروع کیا جائے جس کا منطقی نتیجہ بالآخر، مولانا مودودیؒ کی رائے کے مطابق، قیامِ ریاست اسلامی کی صورت میں نکلے گا۔ لہٰذا شوریٰ کو چاہیے کہ جماعت کی پالیسی تبدیل کر دے۔ صرف امیر جماعت کے بدلنے سے کچھ خاص فرق نہیں پڑے گا۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

---

[1] ماہنامہ البرہان شمارہ جون ۲۰۲۰ء

مطالعۂ کتاب

مکرم محمود ۞۱

'ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں'

کتاب 'جمہوریت کی حقیقت' از ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

ڈاکٹر انصاری صاحب کی کتاب اور ان کی عمومی فکر کا خلاصہ اور اس پر تبصرہ

[راقم کو ڈاکٹر محمد امین صاحب نے بتایا کہ ''جمہوریت کی حقیقت'' کا ایک نسخہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے مجھے بطورِ خاص بھجوایا ہے اور اس پر تبصرے کی فرمائش کی ہے۔ مَیں ان کا انتہائی ممنون ہوں۔ ڈاکٹر امین صاحب تحریر کے سلسلے میں (اپنے ماہنامے کی وجہ سے) جلدی کرنے کے قائل ہیں چنانچہ مجھے خدشہ رہا کہ وہ مطلوبہ تبصرے کا مطالبہ کریں گے۔ ادھر میں چند دیگر مصروفیات کے ساتھ کچھ دنوں سے یادداشت میں کمزوری (dementia) کا شکار ہوں اور افکار و تصورات کے باہمی ربط کو سمجھنے میں خاصی دشواری ہونے لگی ہے۔

معاً میرا ذہن عزیزم مکرم محمود کی طرف گیا کہ وہ یہ کام بطریقِ احسن کر سکتے ہیں۔ یہ بہترین علمی و عقلی صلاحیت کے ساتھ سماجی علوم، فلسفہ اور دینی لٹریچر پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ قرآن اکیڈمی لاہور کی ایک ہفتہ وار کلاس میں جس طرح انہوں نے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی "الانتباهات المفیدہ عن الاشتباهات الجدیدہ" پچیس تیس اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی کلاس کو سبقاً سبقاً پڑھائی ہے اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ چنانچہ مَیں نے پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ یہ کام ان کے ذمے لگایا۔ امید ہے ڈاکٹر انصاری صاحب میرا عذر قبول کرتے ہوئے عزیزم کی اس تحریر پر ہمت افزائی اور رہنمائی فرمائیں گے۔ ابصار احمد عفی عنہ] ۞۲

علوم و نظریات کو ایک اصلِ واحد فراہم کرنا انسانی شعور کا فطری اقتضاء ہے۔ اس اصلِ واحد سے تمام علوم و نظریات کو ایک تعریف مہیا کرنا اور اس اصل کو جملہ فروعات میں جاری

۞۱ معلم و دانشور، نبیرہ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم

۞۲ ڈاکٹر صاحب سابق صدر شعبۂ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی و برادرِ خورد ڈاکٹر اسرار احمدؒ ہیں

وساری دکھانا انسان کی قوتِ نظریہ کے لیے منتہائے کمال ہے۔ کمالِ علمی ونظری یہی ہے کہ ایک بڑے تصور سے جملہ تصورات کو برآمد ہوتا ہوا دکھایا جائے اور انسانی نفس، معاشرہ، ریاست، ادارے، علوم، فلسفہ اور تہذیب میں اس عظیم تصور کے سریان کا مشاہدہ کروا دیا جائے اور مشاہدہ کرنے والوں کو اس میں کوئی بہت زور زبردستی اور جبر کا گمان نہ ہو۔ ہر علم میں کسی ایسے ہی تصور اور نظریے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے جو تمام مظاہر کی تحدید کرے۔ ایسا مرکزی تصور کہ تصورات و مظاہر کے تمام دائرے اس مرکز سے پھوٹتے ہوں۔ جدیدیت کی تعریف کرنے کی کوشش میں ایسے کئی مرکزی تصورات وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے ذریعے جدیدیت کے جملہ مظاہر یعنی خاص طرح کا انسان، علم وتہذیب، فلسفے، اداروں وغیرہ کی تعریف ہو سکے گویا وہ تصور ان سب کا احاطہ فطری طریقے سے کر سکے۔ لیکن چونکہ جدیدیت کے کچھ مظاہر آپس میں نسبتِ تضاد رکھتے ہیں (مثلاً سرمایہ داری اور اشتراکیت) اس لیے اکثر اس طرح کے تصورات کو ناکام ہوتے ہی دیکھا گیا ہے۔ آزادی اور انسان پرستی ایسے تصورات بہت حد تک کامیاب ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب اس سے آگے بڑھ کر وہ اصل اور مرکزی تصور ''سرمایہ'' کو قرار دیتے ہیں جو آزادی کی مجسم شکل ہے (آزادی اور جبر یہاں ایک ہو جاتے ہیں) اور اس عظیم تصور کو جدیدیت کے جملہ مظاہر اور ان کے جزء جزء میں جا کر نہایت کامیابی سے سرایت کیا ہوا دکھا دیتے ہیں۔ سرمایہ پرستی وہ مہا تصور اور اصل الاصول ہے جو اپنے مرکزی قانون ''قانونِ تحکمِ سرمایہ'' Rule of the law of Capital کے ذریعے ایک خاص طرح کی انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو جنم دیتا ہے جس کی بنیادی اقدار آزادی، مساوات اور ترقی ہیں۔ سرمایہ پرستی درحقیقت حرص اور حسد کی تجسیم ہے۔ سرمایہ پرستی درحقیقت نفس پرستی ہے۔ نفس پرستی کو بھی وہ مرکزی تصور بنایا جا سکتا تھا مگر خالی نفس پرستی کسی نظام کو جنم نہیں دے سکتی۔ یہ نفس پرستی جب سرمایہ کی معروضی شکل اختیار کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں ایک منظم اور مربوط قسم کا نظام وجود میں آجاتا ہے۔ سرمایہ پرستی انفرادیت واجتماعیت کو جامع ہے۔ ہیومن بی اِنگ (وہ انسان جو سرمایہ دارانہ اقدار قبول کر لیتا ہے) اپنی انفرادی خواہشات واغراض بھی عمومی سرمایہ کی بڑھوتری کے بغیر مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داری (Capitalism) اور اشتراکیت (Socialism) کے

بظاہر اختلاف کو بھی ڈاکٹر انصاری صاحب اسی اصل الاصول کی بنیاد پر حل کر دیتے ہیں کہ ان میں اختلاف سرمایہ کی تنظیم میں ہے سرمایہ پرستی پر دونوں متفق ہیں۔ انسان جب قانونِ تحکمِ سرمایہ کو قبول کر لیتا ہے اور آزادی کو اپنی اساسی قدر قرار دے دیتا ہے تو وہ سرمایہ دارانہ عقلیت (Rationality) کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس کو ہیومن بی اِنگ کہا جاتا ہے۔ حقوقِ انسانی صرف اس ہیومن بی اِنگ کے ہی ہوتے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو چیلنج کرے گا وہ ہیومن رائٹس سے محروم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر انصاری صاحب جمہوریت کو بھی سرمایہ داری کے ایک ذیلی نظام کے طور پر دیکھتے ہیں یعنی جمہوریت کو بھی اس مرکزی تصور سے پیدا ہونے والے کلّی یا نظاماتی تناظر میں سمجھتے ہیں۔ جمہویت اپنی موجودہ شکل میں عوام کی حکومت نہیں ہوتی بلکہ ایک خاص گروہ کی حکومت ہوتی ہے جن کو ہم سرمایہ دار کہتے ہیں۔ ہر جمہوری نظام خواہ پارلیمانی ہو، اشتراکی ہو یا استبدادی، قانونِ تحکمِ سرمایہ کا ہی عملی مظہر ہے۔ جمہوری نظام میں اقلیت کی حکومت ہوتی ہے۔ اس اقلیت میں فوج، عدلیہ، انتظامیہ، کارپوریشن، بینک، میڈیا، مقننہ اور اہلِ دانش حضرات شامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام مل کر بھی آبادی کا اقل قلیل ہوتے ہیں۔ یہ سب سرمایہ کے آلۂ کار ہیں اور ان کے اقتدار کا جواز سرمایہ کی خدمت میں پوشیدہ ہے اور ریٹائرمنٹ تک رہتا ہے۔ عوام کو ان میں سے مقننہ کے نمائندوں کو بظاہر بدلنے کا اختیار کبھی کبھی ملتا رہتا ہے اور اسی کو عوامی حکومت کہا جاتا ہے اور عوام اسی پر خوش ہو جاتے ہیں۔ اگر کہیں جمہوری عمل کے ذریعے سرمایہ کی حاکمیت ہی خطرہ میں پڑ جائے تو عالمی سامراج (سرمایہ کا راج) دخول (Encroachment) کے ذریعے اس عمل کو معطل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ روحانیت: حرص، حسد، غضب، شہوت (ڈاکٹر انصاری صاحب سرمایہ دارانہ روحانیت کی ایک خاص اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس سے مراد وہ رذائل نفس ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کو ایک انفسی بناء اور جواز فراہم کرتے ہیں)، اور سرمایہ دارانہ عقلیت: طبیعی اور سماجی علوم کا اگر عوامی غلبہ اور نفوذ ہو تو عوام اس سرمایہ کی حاکمیت کو برضا و رغبت قبول کرتے ہیں اور مقننہ کے نمائندوں کے طور پر ایسے ہی لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جو سرمایہ کے بہترین خادم ہوں۔

اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جدیدیت کے بہت سے مظاہر پر حکم لگانے میں جو غلطی

ہوتی ہے اس کی اساس یہی ہے کہ کسی تصور، ادارے یا طریقۂ کار پر اس کو اس کی فلسفیانہ اساسیات، نظاماتی تناظر اور نظریاتی سیاق وسباق سے کاٹ کر حکم لگا دیا جاتا ہے اور اس قانون کی پاسداری نہیں کی جاتی کہ کسی شئے پر حکم اس کے صحیح تصور کے بعد ہوتا ہے (الحکم علی الشئی فرع عن تصورہ)۔ جدیدیت کے مظاہر کی ماہیت کا علم ان کو ایک کلّی تناظر اور سیاق وسباق میں رکھے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور صحیح تصور کا حصول ماہیت کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔ نظاماتی کلی تناظر سے کاٹ دینے کی وجہ سے جدیدیت کے کسی مظہر کو قبول کرلیا جاتا ہے جو اپنی اقدار خاموشی سے ساتھ لے کر آتا ہے ۔

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

ڈاکٹر انصاری صاحب کا یہ ایک بڑا کام ہے کہ وہ اس نظاماتی تناظر کو صاحبانِ افتاء و ارشاد کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نظاماتی کلی تناظر سے ذہول ہو تو فقہ و قانون میں نہایت اخلاص کے باوجود سرمایہ دارانہ اداروں اور سرمایہ داری کے دیگر مظاہر کے لیے گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نظامِ فکر کی ایک اور خوبی فکر و عمل کا اجتماع ہے یعنی Praxis and theory دونوں کو شامل ہے۔ ان کی فکر کا فوری اثر ایک جدیدیت گزیدہ شخصیت پر مثبت ہوتا ہے کہ وہ جدیدیت کے بہت سے نظری، عملی اور ٹیکنالوجیکل مظاہر سے محتاط ہو جاتا ہے اور مغرب کو پچھاڑنے کے لیے ان کے ساتھ ریس لگانے کی سفیہانہ (نتائج کے اعتبار سے خطرناک) حکمتِ عملی کو اختیار نہیں کرتا اور فوری کیے جاسکنے والے کاموں پر توجہ دیتا ہے اور سسٹم کے تضادات اور رخنوں (loop-holes) کو اپنے لیے مفید مطلب بنا لیتا ہے۔ اس سے دین کی مطلوب شخصیت اور اس کی ظاہری و باطنی ہیئت محفوظ رہ سکتی ہے وگرنہ اگر جدیدیت کے جملہ مظاہر کو مکمل طور پر اختیار کر کے (چاہے اس کے لیے اضطرار کا عذر ہی کیوں نہ ڈھونڈ لیا جائے) یعنی ریس میں مغرب سے آگے نکل کر اس کو شکست دینے کی کوشش کی گئی تو دین کی مطلوب شخصیت کی بقاء قریب قریب ناممکن ہو جاتی ہے ۔

ایں خیال است و محال است و جنوں

ڈاکٹر صاحب کی فکر کی یہ افادیت روایتی دینی حلقوں کے لیے بہر حال مسلم ہے۔ دوسری طرف کچھ دانشور اور مفکر حضرات شعوری سطح پر جدیدیت کی نفی کر کے عمل میں جدیدیت کے ادارہ جاتی اور ٹیکنالوجیکل مظاہر مکمل طور پر اپنانے اور برتنے کی بات کر رہے ہیں کہ اس کے ذریعے اقتصادی اور معاشی ترقی ہوگی اور قوت کا حصول ہوگا اور قوت کا حصول شرعی تقاضہ ہے۔ وہ نظام باطل اور اس کے ادارہ جاتی اور ٹیکنولوجیکل مظاہر کی تحولاتی اور تحویلی طاقت اور انسانی نفس میں اس کی نفوذی کاروائی سے یا تو ناواقف ہیں یا اپنے تئیں ایک بڑے مقصد کے لیے ان اثرات کو قبول کرنے پر راضی ہیں۔ (یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کی جدید تعبیرات کو بظاہر رد کرنے کے باوجود وہ دین کے نظام مراتب کو وہیں سے اخذ کرتے ہیں اور ذرائع کو مقصود بالذات کہہ کر مسلمانوں کو اس کا مکلف بنا دیتے ہیں جس کی اصلاً تکلیف مسلمانوں کو ان کے رب کی طرف سے دی ہی نہیں گئی۔ خیر یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے)۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ''پس چہ باید کرد'' کے طور پر جو وہ حکمتِ عملی بیان کرتے ہیں وہ منفیت سے یکسر خالی ہے اور سب دینی کاموں کو ساتھ لے کر چلنے والی all inclusive ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب تحفظِ دین اور غلبۂ دین کی تحریکوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں اور ان کے باہمی اشتراک کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہیں۔ عام طور پر جو لوگ امت کے اجتماعی مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہیں ان کا طرزِ فکر تحدیدی (Reductionist) ہوتا ہے کہ بس یہی ایک کام جو وہ صاحب بتا رہے ہیں وہی کرنے کا ہے باقی سب کام کم اہم، غیر اہم یا لاحاصل ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا یہ طرزِ فکر نہیں ہے۔ وہ اگر کسی منہج کی خامی بیان کرتے ہیں تو اس کے کچھ فوائد و ثمرات جو حاصل ہوئے ہیں ان کا اقرار ضرور کرتے ہیں۔

محمد قطب صاحب کے ہاں ''جبہات'' (fronts) کا ایک تصور ہے کہ اسلامی تحریکی عمل کو مختلف محاذوں پر جاری رہنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے war of position کا تصور مجھے اس سے کچھ ملتا جلتا لگا کہ دشمن کو مختلف محاذوں پر پیچھے دھکیلتے چلے جانا اور اپنی جگہ پیدا کرتے چلے جانا ہے۔ (اس کی کچھ تفصیل آگے کتاب کے دو ابواب کا جو خلاصہ دیا گیا ہے وہاں آجائے گی) دخول کی حکمتِ عملی کے ڈاکٹر صاحب مخالف ہیں کہ اس کے نتیجے میں سرمایہ

دارانہ اداروں اورنظریات کی اسلام کاری ہوتی ہے۔(دخول سے مراد ہے کچھ اداروں اور نظریات کومکمل طور پر اپنالینا۔)ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جمہوریت کاتعلق سرمایہ داری سے چونکہ حادثاتی ہے اس لیے جمہوری عمل کومکمل طور پر اپنائے بغیر حکمتِ عملی کے تحت استعمال کیا جاسکتا ہے۔شعوری سطح پر جمہوری عمل کے نظاماتی اورنظریاتی سیاق وسباق کوسمجھتے ہوئے اس کی مکمل نفی اورعمل میں استعمال کاطریقۂ کار،عمل میں مکمل طور پر اپنانے کاطریقۂ کارنہیں ہے جیسا کہ بعض دانشور حضرات کے ہاں ہے بلکہ عمل میں استعمال سے مراد intelligent manipulation ہے جہاں استعمال کر کے اپنا کام نکالنا ہے یا کچھ فوری مقاصد کوحاصل کرنا ہےاورمختلف محاذوں میں سے ایک محاذ اس کوقرار دینا ہے نہ کہ واحد محاذ سمجھنااورقرار دینا۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک انفرادیت،معاشرت اورریاست تینوں محاذوں پر کام کرنے کی بیک وقت ضرورت ہے۔اسی ضمن میں وہ مسجد کومرکز بنانے کی اور خانقاہ کے احیاء کی بات کرتے ہیں۔اسی طرح محلے کی سطح پر کام کرنے کی ضرورت کواجاگر کرتے ہیں۔ان کے خیال میں سرمایہ داری کے خلاف اصل جنگ معاشرہ کی سطح پر لڑی جائے گی۔یہ انتہائی باوقعت اور بصیرت افروز باتیں ہیں۔اس بصیرت سے اکثر انقلابی جماعتیں اور تنظیمیں محروم ہیں۔وہ تو شاید مسجد مرکزیت اور خانقاہ کے احیاء کی بات کو لائقِ تمسخر ہی سمجھیں۔ڈاکٹر صاحب کے ہاں فرد کی اصلاح اسی طریقے پر ہوگی جس طرح ہماری روایت میں ہوتی آئی ہے۔فرد کی اصلاح کا کوئی انقلابی طریقہ کار ڈاکٹر صاحب نے الحمدللہ وضع نہیں کیا۔اپنی روایت اوراس کے اداروں کومکمل طور پر قبول کرنا ڈاکٹر صاحب کاامتیاز ہے۔

کتاب ''جمہوریت کی حقیقت'' کی ابواب بندی علامہ اقبال کے مصرعوں کی صورت میں نہایت خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔دو ابواب مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور ڈاکٹر زاہد صدیق مغل صاحب نے تحریر کیے ہیں۔جن میں اصولاً ڈاکٹر انصاری صاحب کی فکر سے اتفاق پایا جاتا ہے مگر عملاً جمہوری نظام میں شرکت کو یہ دوحضرات غالبًا جائز نہیں سمجھتے۔باب ۹ ''سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں'' جو ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل صاحب نے تحریر فرمایا

ہے، لاجواب و بے مثال ہے۔ خلافیت و ملوکیت کی اس مزعومہ تفریق ، جو بہت سی فکری گمراہیوں کا منبع ہے (یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ دی گئی ۔ بہت بڑی بڑی گمراہیوں اور غلط فہمیوں کے پیچھے اس تقسیم کا ہاتھ ہے) اور جدید جمہوری فکر سے ذہنی مرعوبی کی علامت ہے، کا دلائل کے ساتھ استیصال کرتا ہے۔ اہلِ علم کو یہ باب ضرور دیکھنا چاہیے۔ خلافت و ملوکیت کی تفریق کے بجائے درجات خلافت کے ذریعے اسلام کی سیاسی تاریخ کو دیکھنے کے طریقۂ کار کو زاہد مغل صاحب نے عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے اور اہل فکر و دانش کے دیکھنے کے لائق ہے۔ آگے ہم دو ابواب ، جماعت اسلامی کا منہج اور مجوزہ حکمت عملی ، کا خلاصہ بیان کرتے ہیں جس سے ڈاکٹر انصاری صاحب کی فکر اور منہج عمل کو سمجھنے میں آسانی ہوگی ۔

مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے فکر و منہج تبدیلی و انقلاب کے تجزیہ پر مشتمل باب لائقِ دید ہے۔ ڈاکٹر انصاری مودودی صاحب کی فکر کے ان دو ستونوں : (۱) مغرب جاہلیتِ خالصہ ہے (۲) اسلام مکمل نظامِ حیات ہے، سے تو متفق ہیں مگر جمہوریت کو اسلامی انقلاب کا ذریعہ سمجھ لینے (نہ کہ مختلف محاذوں کی طرح کا ایک محاذ)، روایت اور روایتی علماء پر تنقید اور روایتی اداروں مثلاً مسجد، محلہ، بازار، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ کو اپنی جدوجہد کا مرکز نہ بنانے جس کی وجہ سے برصغیر کے مسلم سماج و معاشرہ سے کٹ جانے پر تنقید کرتے ہیں۔ (مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ برصغیر میں کوئی بھی انقلابی تحریک ''مقامی'' ہوئے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی یعنی جو عوام اور معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط نہ رکھتی ہو۔) اور مقامی تہذیبی رجحانات سے پہلو تہی کو عوام کی زندگی سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لینا قرار دیتے ہیں۔ سیاسی عمل اگر معاشرہ میں اپنی جڑیں نہ رکھتا ہو تو یہ کارِ لاحاصل ہے۔ سماجی ادارتی صف بندی اور روایتی معاشرتی اداروں کا احیاء سیاسی عمل کے ساتھ ساتھ ضروری ہے۔ فرد اور معاشرہ میں نفوذ کے بغیر دین کا نفاذ ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب مولانا مودودی کے افکار پر مندرجہ ذیل تنقیدات کرتے ہیں:

۱۔ مولانا کے ہاں مغربی تہذیب کے رد کا مطلب جدیدیت یا سرمایہ داری کی اصولی

تردید نہیں بلکہ رائج سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کی ایسی اسلام کاری ہے جس میں نظام اپنے مظاہر میں تو نہ بدلے لیکن اس کی مابعد الطبیعیات اور عقائد کو بدل دیا جائے۔

۲۔ الٰہی جمہوریت (Theo-democracy) کا تصور اسلامی سیاسی تشکیل کی جدید شکل ہے۔

۳۔ دین کے معانی حکومت کے لینا ایک اجنبی تصور ہے۔

۴۔ مولانا کی فکر میں بھی آزادی ایک کلیدی تصور ہے۔

۵۔ مولانا ہندوستانی مسلم سوسائٹی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ معاشرتی ادارتی تشکیلِ نو سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ معاشرتی تغیر موجودہ معاشرتی اداروں (برادریوں، پنچایتوں، خانقاہوں، مدارس، مساجد، بازار) کی کارفرمائی میں شمولیت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کو ایک بالادست اشرافیہ تعلیمی اور سیاسی عمل کے ذریعے مسلم معاشرے پر مسلط کرے گی۔

۶۔ جماعت کا نظم vanguard party کی طرز کا ہے۔

۷۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے غیر علماء مسلم ترمیم پسندوں (revisionists) کا ایک گروہ جماعت پر چھا گیا ہے جس کی قیادت پروفیسر خورشید احمد کر رہے ہیں۔

۸۔ نارمل روایتی انتخابی عمل انقلاب ساز ماحول کی پرورش نہیں کرتا بلکہ انتخابی عمل کو انقلابی بنانے کی ضرورت ہے۔ جماعت نے انتخابات کو کبھی انقلابی بنیادوں پر نہیں لڑا۔

۹۔ مولانا مودودی کی فکر میں سرمایہ دارانہ نظام کو محض ایک ہیئت سمجھا گیا ہے۔ اس کی انفرادی اور معاشرتی جڑوں کا کوئی شعور نظر نہیں آتا۔

۱۰۔ اشتراکیت پر تنقید تو ہے مگر سوشل ڈیموکریسی پر کوئی تنقید مولانا کے ہاں نہیں ملتی۔ سوشل ڈیموکریٹ فکر جماعت کی پالیسی سازی پر چھائی ہوئی ہے۔

۱۱۔ جماعت کے پاس تحریک کا کارکنوں کو معاشرتی سطح پر اقتداری اداروں میں منظم کرنے کا کوئی پروگرام موجود نہیں ہے۔

۱۲۔ مولانا مودودی کی فکر کو اکابر علماء اور صوفیائے برصغیر کے اشارات وافادات سے منطبق کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی لہذا جماعت اپنی فطری مخاطبین سے کٹتی چلی جا رہی ہے۔

۱۳۔ ہمارا نظامِ تربیت اس وجہ سے ناقص ہے کہ برصغیر میں مروج طریقوں کے برخلاف وہ کتابی اور درسی ہے، صحبتی اور مراقباتی نہیں۔ڈاکٹر انصاری صاحب مولانا مودودی کی فکر کی مسلسل تطہیر،تفسیر،تشریح اور تنقید کے قائل ہیں۔اسی ذریعہ سے انقلابی عمل آگے بڑھے گا اور سرمایہ دارانہ نظام میں اقتدار بتدریج مسلم انقلابیوں کے ہاتھ میں آتا جائے گا۔یہی ریاست میں ریاست (state within state) بنانے کا عمل ہے۔چونکہ سرمایہ دارانہ نظام کا کوئی بیرون (exterior) نہیں ہے اس لیے مختلف محاذوں پر لڑتے ہوئے غلبہ دین کی جدوجہد کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

''میں ڈھونڈ رہا ہوں سمِ افرنگ کا تریاق'' کے عنوان سے کتاب کے باب نمبر ۱۲ میں جو مجوزہ حکمتِ عملی دی گئی ہے وہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کے منہج کی جامعیت اور اس کے غیر تحدیدی (non-reductionist) ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ڈاکٹر صاحب ہر سطح پر کام کی افادیت اور ضرورت کے قائل ہیں۔فرد کی سطح پر تربیت کے لیے روایتی ادارہ تربیت یعنی خانقاہ اور اس کی اساس یعنی علم تصوف کے احیاء کی بات کرتے ہیں۔معاشرتی سطح پر مسجد، محلہ، برادری، پنچائیت جیسے روایتی معاشرتی اداروں میں نفوذ کے قائل ہیں۔ریاستی سطح پر بھی ہر ممکن اور مفید طریقے، سمیت انتخاب اور جمہوری عمل، برتنے کے قائل ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی فکر اور حکمتِ عملی کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ سرمایہ داری ایک نظاماتی کل ہے۔اس کی تسخیر اس کے اندرون میں موجود تضادات کو بڑھاوا دیے بغیر ممکن نہیں ہے۔(یہ مارکسی نقطۂ نظر ہے۔یہ جملہ تنقیدی نہیں توضیحی ہے)

۲۔ عوام کے حال اور قلبی کیفیات کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے بغیر ان کی حمایت حاصل کرنے کا مطلب حرص و ہوس کے معاشرتی و ریاستی غلبے کو جواز فراہم کرنا

ہے۔حال کو بدلنے اور بندگی رب پر آمادہ کرنے کے لیے نظامِ خانقاہ وارشاد کی تطہیر، توسیع اور احیاء کی ضرورت ہے۔تصوف ہی ہماری تاریخ کی معتبر عوامی تحریک ہے۔

۳۔ سرمایہ دارانہ نظام کے غلبہ کا ایک اہم پہلو علمیاتی ہے، اس لیے اس کا علمی نقد مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو اس کے فکری تضادات کو عیاں کرے۔

۴۔ سرمایہ دارانہ اداروں اور اعمال کو ان کے نظاماتی تناظر سے جدا کر کے نہ دیکھا جائے۔یہیں سے اسلامیانے (Islamization) کی تحریک جڑ پکڑتی ہے۔ڈاکٹر صاحب Islamic Finance کو اسلامی حرام خوری کہتے ہیں۔

۵۔ روایتی معاشرتی اداروں کو زندہ کرنے اور ان کو اسلامی ہدایت سے سرشار کرنے کی ضرورت ہے۔ Civil society کا یہیں سے خاتمہ ہو جائے گا۔مسجد کو مرکز بنانے کی ضرورت ہے۔

۶۔سرمایہ داری کے خلاف یہ جنگ نظاماتی تناظر میں لڑی جائے گی لیکن اس کا فیصلہ کُن میدان معاشرہ ہے ریاست نہیں۔

۷۔ جمہوری عمل سے نہ سہو نظر ہوگا اور نہ اس میں روایتی انداز میں شرکت ہوگی بلکہ اس کو اپنی انقلابی حکمتِ عملی کے لیے مفید بنایا جائے گا۔جمہوریت کو اسلامی طرزِ حکومت سمجھنا سخت غلطی ہے۔

۸۔ مصلحین کی جماعتوں اور اسلامی سیاسی جماعتوں میں اشتراکِ عمل مفقود ہے۔ہمیں تحفظِ دین کی تحریکوں اور غلبۂ دین کی تحریکوں کو مربوط کر کے اور ہر ایک کے کام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۹۔ اس پوری حکمتِ عملی کو ڈاکٹر انصاری صاحب ایک اصطلاح (جو مستعار لی گئی ہے) war of position سے تعبیر کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے غلبہ کو انفرادی، معاشرتی اور ریاستی سطح پر بتدریج مجروح کرنے کی حکمتِ عملی ہے۔

ان دو ابواب کا خلاصہ چند نکات کی شکل میں ذرا تفصیل سے اس لیے بیان کر دیا گیا تا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی فکر اور منہج کا ایک کلّی خاکہ قریب قریب ان کے اپنے الفاظ اور ان کی اپنی اصطلاحات میں سامنے آجائے اور اس کی جامعیت اور شمولیت (inclusivity) آشکار ہو جائے۔ کتاب میں کام کا تو بہت کچھ ہے مگر یہاں سب کو بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

چند ملاحظات

اس تبصرہ کے بعد چند ملاحظات بھی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش ہیں۔ ایک یہ کہ اکیسویں صدی میں cyber space یا internet کی آمد ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ اس کی وجہ سے بیسویں صدی کی بہت سی نظاماتی تفہیمات اب جیسے از کار رفتہ (outdated) لگنے لگی ہیں۔ سائبر اسپیس کوئی جزوی مظہر نہیں ہے۔ سسٹم اگر ریاست و مارکیٹ سے سے مل کر وجود میں آنے والا ایک وجودِ مجرد تھا تو سائبر اسپیس کی صورت میں اسے گویا ایک گھر میسر آ گیا ہے۔ ریاست اور مارکیٹ کا dwelling ground اب سائبر اسپیس ہے۔ جیسے سرمایہ داری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے نئے تعلقات پیدا کیے ہیں تو سائبر سپیس نے بہت سے نئے پرانے تعلقات کو جنم دینے کے ساتھ ساتھ ان تمام نئے پرانے تعلقات کا مفہوم اور دروبست تبدیل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہاں اس کا تذکرہ سرمایہ دارانہ بحرانوں کی فہرست میں مذکور ہے مگر وہ ناکافی ہے۔ یہ کوئی جزوی ظاہرہ نہیں ہے بلکہ ایک کلّی نظاماتی نو تشکیل ہے جس کے اثرات ہمہ گیر ہیں اور انفرادی اور اجتماعی حیات کے ہر گوشے سے متعلق ہیں۔ homo digitalis ایک نئی مخلوق ہے جس کے ''ہونے'' کا مطلب روایتی آدمی کے ''ہونے'' سے قطعی مختلف ہے۔ علم، تعلیم، تعلم کا سارا سیاق وسباق اور دروبست اس نے تبدیل کر دیا ہے۔ علم ومعلومات کا فرق بھی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ تفریح کا غلبہ ہے۔ پڑھنا ہو پڑھانا ہو تفریح ہو عیاشی ہو سب ایک ہی ذریعے سے ہو جاتا ہے (سمارٹ فون)۔ اب influencers کا زمانہ ہے۔ تاثر لینے اور متاثر کرنے کا ذریعہ اب سکرین ہے۔ یہ ایک

عالمگیر فتنہ ہے[۱]

جس کے کچھ نتائج و مظاہر تو سامنے آ چکے ہیں، کچھ آ رہے ہیں (مثلاً AI) اور کچھ مستقبل میں آئیں گے۔ اِس پر غور کی حاجت ہے اور فرد معاشرہ اور ریاست سے متعلق تمام تجزیوں اور حکمت عملیوں کو از سرِ نو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

دوسری گزارش اس حوالے سے یہ ہے کہ اور یہ اعتراض ہمارے ایک محترم استاد کی طرف سے بھی کیا گیا ہے کہ انصاری صاحب کی فکر نے مذاہب اور مذاہب کے عالمی نظام، سیاست اور قومی ریاستوں کے باہمی تعامل، موافقانہ ہو یا مخاصمانہ، پر اثرات کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی فکر میں ہندومت اور یہودیت کو قوم پرستی اور عیسائیت کو لبرلزم میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ گویا ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا اور ان کا کسی قسم کا کوئی کردار نہیں ہے۔ اس بات میں تھوڑی زیادتی (overdoing) محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی مجوزہ حکمتِ عملی یا منہج میں تو تحدیدیت (Reductionism) نہیں ہے (اور یہ ایک بڑی خوبی ہے) مگر ان کی فکر میں بعض مقامات پر تحدیدیت پائی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ

---

[۱] جو اس کو مکمل طور پر فتنہ سمجھتے ہیں وہ تو جائے محفوظ پر ہیں، ''بقاء'' اور ''عمل بقدر تکلیف'' کے اصول پر کاربند ہیں۔ جو اس سے نبرد آزما ہونے، اس کے استعمال اور "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے طریقہ کار کو برتنے کے قائل ہیں، اصل خطرے میں تو یہ لوگ ہیں۔ از کار رفتہ اور سطحی تفہیم و تجزیہ ان کو کفایت نہیں کر سکتے۔ اگر نبرد آزما ہونے کی حکمت عملی ہو اور کسی مظہر کی حقیقت اور واقعیت سے جزوی آشنائی ہو تو ہلاکت ہے۔ اگر مکمل طور پر فتنہ سمجھ کر بقاء کو اصل مسئلہ قرار دیا جائے تو حقیقت سے آشنائی ہی کفایت کرتی ہے مظہر کی واقعیت کی چاہے صرف بنیادی جانکاری ہی ہو۔ مکمل طور پر فتنہ قرار دینا ہی دراصل حقیقت سے آشنائی ہے۔ وہ اس کی حقیقت سے گویا واقف ہیں اس کی واقعیت کے نظاماتی اور ٹیکنیکل فہم کی ان کو کوئی اتنی حاجت نہیں ہے۔ ''عمل بقدر تکلیف'' کا فہم بھی وہ روایتی دینی فہم سے اخذ کرتے ہیں نہ کہ جدید دینی تعبیرات سے جہاں دین کے نظام مراتب کی ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے۔ یہ واضح رہے کہ "عمل بقدر تکلیف" کا اصول ''رخصت کے منہج'' پر اپنی اساس نہیں رکھتا۔ بلکہ درحقیقت اصحابِ عزیمت وہی ہیں جو اس اصول پر کاربند ہیں۔ رخصت پر دراصل عامل تو نبرد آزما ہونے والے حضرات ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس حکمت عملی میں ایسی معاملات پیش آتے ہیں جو یا تو مشتبہ ہیں یا ابھی تک علماء کی ایک بڑی تعداد کا اس کے بارے میں حرام ہونے کا فتوی ہے۔ مثالوں کی حاجت نہیں۔ العاقل یکفیہ الاشارہ۔ تعامل تو فتنے کے ساتھ بھی ہوتا ہے مگر اس کے اصول بالکل مختلف ہوتے ہیں اور تکدر و تلویث کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

غلبے کے اس دور میں بھی مذاہب کا ایک کلیدی کردار بہرحال ہے۔ روس کے موجودہ کردار میں Orthodox Christianity کا بھی ایک حصہ ہے اور وہ لبرلزم کے خلاف با قاعدہ ایک مذہبی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اسی طرح یہودیت قوم پرستی کو اپنے مذہب سے برآمد کرتے ہیں (نحن ابناء اللہ و احباءہ، یہودیت اپنی بگڑی ہوئی شکل میں شروع ہی سے قوم پرست ہے۔ مابعد لبرلزم قوم پرستی میں ضم نہیں ہوئی) جبکہ مسلم قوم پرستی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب سے برآمد نہیں ہوتی یا ہو سکتی۔ اسی طرح اگر آخر الزمان سے متعلق روایات کو دیکھا جائے تو ان میں بھی دین حق اور مذاہب باطلہ بنیادی کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں (یہ نہیں کہا جا رہا کہ وہ وقت آ چکا ہے یا نہیں، اپنی بات کو ایک ضمنی تائید اس سے فراہم کی گئی ہے)۔ اس ساری بات کا مطلب یہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا سارا تجزیہ سرے سے ہی بے اساس ہے بلکہ overdoing اور تحدیدیت کے زیرِ اثر کچھ دوسرے اہم عوامل کو نظر انداز کر دینے کی بات کی جا رہی ہے۔

تیسری گزارش اس حوالے سے ہے کہ خمینی صاحب کے عقائد و نظریات سے اگر واقفیت ہو اور پھر ایرانی انقلاب کو خالص اسلامی انقلاب کہا جائے تو یہ بات کچھ سمجھ میں آ سکنے والی نہیں ہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب افغانستان کے مجاہدین ہوں یا ایرانی انقلاب برپا کرنے والے سب کو ایک ہی سطح پر رکھ دیتے ہیں کسی قسم کا کوئی امتیاز نظر نہیں آ رہا ہوتا۔ تحریف قرآن، امام کی عصمت اور شارع ہونا اور حضرات خلفائے راشدین پر منافقت اور کفر کے الزامات جیسے عقائد کے اصولی اور صریح گمراہی ہونے کے بارے میں تو اہلسنت کے ہاں دو آراء نہیں پائی جاتیں، ہاں ان عقائد کے حاملین کی تکفیر کے حوالے سے دو آراء ضرور پائی جاتی ہیں۔ اس پورے انقلابی عمل اور جدوجہد (ایرانی) کو اس کے عقائد و نظریات سے کاٹ کر دیکھنے میں انصاری صاحب اپنے ہی اصولوں کے خلاف جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ملا عمر اور حسن نصر اللہ (حزب اللہ، لبنان) کو ایک ہی مقام پر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جہادی اور انقلابی جدوجہد کو وہ مرکزی حیثیت دے دی گئی ہے جو اصلاً عقائد کو حاصل ہے۔ یہ دین کے نظامِ مراتب میں وہ تبدیلی ہے جو دین کی جدید انقلابی تعبیرات کا شاخسانہ ہے۔ اس پر غور کرنے کی حاجت ہے۔

Dr. Javed Akbar Ansari

Understanding Contemporary Capitalist Order

Capitalism is both a lifeworld and a governance system. As Islamic revolutionaries we are struggling to overcome capitalism but this struggle in its predominant form must take place within capitalist order. It is therefore essential for Islamic revolutionaries to understand how contemporary capitalism works. Without such an understanding we will not be able to identify and intensify its systematic contradictions.

Capitalism emerged first as a system of governance and then as a lifeworld in the 11th century AD in a few Italian coastal cities. From the 16th century to the end of the 18th century AD it consolidated its hold over Europe and America and built several nation states. The imperialist capitalist conquest of Asia, Africa and the Americas enabled it to become the dominant system of governance globally.

Throughout its history capitalist form of governance has evolved. Capital – the spirit of *hirs* and *hasad* (*takathur*) governs individuals and societies through organization of markets and states. The organizational forces of capitalist markets and states have evolved throughout history. These organizational forces can be described as "regimes of accumulation".

The regime of accumulation – the form of market and state organization – that has emerged in the twenty-first century is somewhat different from the earlier forms of capitalist accumulation regimes. In this essay we shall describe this contemporary accumulation regime and attempt to develop some suggestions regarding the appropriate Islamic

revolutionary response.

Monopoly and Competition

The Italian economist Ugo Pagano has described the new capitalist regime as "intellectual monopoly capitalism". Competition in capitalist markets necessarily and eventually leads to the growth of monopoly. The twenty-first century regime of accumulation is characterized by the monopolization of information by America (Google, Apple, Facebook, Microsoft, Amazon) and China (Badiu, Alibaba, Tencent) based firms.

Capitalist competition has always served as a means for abolition of private property – that is why the corporation is the archetypal form of capitalist property. Monopolization of resources – oil, pharmaceuticals, finance, information – serves the same purpose, the purpose of the abolition of private property. Monopolization of information deprives individuals of the possessive use of their information resources. The monopoly force of Big Oil, Big Pharma and Big Tech is underwritten by the legislative acts of the United States and China. Currently capitalist states create informational monopoly through the enforcement of intellectual property rights (IPRs) creating a global monopoly over its application. The leading Big Tech firms (Apple, Microsoft, Alibaba) monopolize information use and other firms' capacities to absorb information flow innovations is systematically limited.

Limiting information possession and usage has largely been practiced through capitalist legislation by capitalist states. Thus the corporation has the legal right to use information created by its employees during the work process – it also has the right to shield an ever-increasing range of trade rights.

Since the 1990s the American system of information monopolization by corporation has been globalised through the UN/WTO based Trade Related Intellectual Property Rights (TRIPS) Agreement originally drafted by the American corporations: International Business Machine (IBM), Pfizer and Microsoft. Information components of production processes were legally treated as independent assets of corporations. "Patent thickets" have emerged whereby innovations are split into several patents making imitation very difficult (as Apple did with the iPhone).

On the other hand there is no legislation regarding who can collect Big Data and for what purpose. There are no standardised measures for valuing data held by Big Tech. Permissive legislation has also enhanced appropriation for Big Tech's 'offshoring'. Big Tech has emerged as a leading lobbyist in Washington and within the Chinese Communist Party.

Big Tech Dominance

Big Tech dominates the intellectual/information economy. Its almost exclusive access to harvest data, the dramatic concentration of digital information and its control of data centers and under sea cable system creates formidable barriers to entry in the industry for smaller firms.

The Big Techs processes heterogeneous data, vast amount of it through most advanced artificial intelligence algorithms which are kept secret. They are capable of learning by themselves as they crunch data. Thus patented technologies become obsolete before they can be imitated by other firms. AI serves as a self-enforcing monopoly mechanism. In the 'cloud business' – dominated by Microsoft, Amazon and Google – intangible assets that Big Tech appropriates from

others are sold as a “black box” meaning that the buyer cannot have access to the underlying algorithms. The use of the ‘service’ generates more data, thus the user contributes to the build up of the monopoly powers of the cloud service providers. ‘Open source’ services by Alibaba, Microsoft, Google are designed to enable their users to contribute to the build up of the business and contributes to the monopoly power of these Big Tech corporations.

The packet system is used to increase the monopoly force and surplus appropriation by Big Tech. This is especially the case of research contracts extended by Big Tech corporations in the areas of computer studies, genetics, criminal studies, robotics based surgery and political ‘science’.

Take Microsoft in 2022, a world leader in AI patents. It has good relation with both the US government and the Chinese Communist Party. Its researchers include American and Chinese scientists. In 2022 it extended 4516 research contracts. But it monopolized patent ownership. The total number of patents obtained in 2022 was 35,233. Co-owned patents were only 318. Thus Microsoft owned 99 percent of total patents registered. Microsoft thus monopolized information generated by outside scientists. 88 percent of its research was co-authored while only one percent of the research output generated some revenue for outsiders.

Systemic Impact

In the existing capitalist regime of accumulation Big Tech exercises power over society’s information and over most other capitalist firms. Most corporations become dependent on Big Tech and smaller firms in the IT industry are forced to become innovation contractors. Most corporations contribute to capital accumulation by Big Tech. These Big Tech

corporations are leading organizations of global supply/value chains without directly controlling the tangible means of productions. Imperialism is informationally technologised .

Capital is accumulated by the Big Tech monopolies through out the 'whole value chain' that depends on its intangible assets (information). The monopoly involves control not only over production in the subordinated firms but also over credit condition and product quality. Subordinated firms become dependent on information monopolists for consumer access. Big Tech plays a key role in global planning. Strategic planning by Big Tech firms exceeds their legally owned assets. It is a principal mechanism for organizing capitalist product, labour, and financial, markets since they have access to detailed data through self-learning AI algorithms.

While Big Tech depends crucially upon the legislative and regulatory support of the imperialist state- especially America and China – their global planning and market strategies do not always cohere to the national interest of the imperialist states which are nation-states. The pursuit of national interest by imperialist states thus plays a role in limiting the planning reach and monopoly power of the Big Tech corporations. The ultimate source of hegemonic power remains the imperial nation-state which seeks to use, sometimes successfully sometimes not, Big Tech as one of its instruments for the exercise of its hegemonic systemic powers.

The growth of informational monopoly has systemic costs reflected most conspicuously in the decline of the rate of growth of production in the global economy since the 1970s until today and in the environmental catastrophe confronting

the world to which Big Tech contributes intensely. Big Tech endeavors to perpetuate its temporary monopoly of information into a permanent advantage has led to the stagnation of capitalist growth, excessive financialisation and system imploding integration.

The Islamic Revolutionary Response

The power sustaining informational monopoly capitalism is the capitalist state which provides the legal framework for its governance processes. State power must be used to break the social stranglehold of the information monopolist corporations.

Alhamdolillah two Islamic states – Iran and Afghanistan – exist today. They must resolve to challenge the power of the information monopoly. Two initiatives are essential in this regard.

First of all Iran and Afghanistan must reject participation in the global regulatory regime built around TRIPS and administrated through the World Intellectual Property Organization (WIPO) and the World Trade Organization (WTO). They must reject constraints imposed by WIPO and WTO on the national use of technological innovations and effectively subvert the patent systems in their national economies.

Secondly they must urgently develop nationalized information service platforms and effectively exclude global monopoly corporations from making inroads into national economy and society. Information satellite sabotage must be thwarted and internet provision to the business sector and the general public must be strictly regulated and channeled through the nationalized information service platform. Information management must be a component of the military

strategy of the Islamic states for multinational information corporate planning and strategy is an integral element of the war of terror the imperialist capitalists are waging against the Islamic states.

In non-Islamic state Muslim countries such as Turkey and Pakistan Islamic groups and *mukhliseen-e-deen* (those who seek to live Islamic lives, individually and socially) must recognize that all IT devices' usage in their countries is subordinated to the surveillance of the imperialist states and their client informational monopoly corporations. The most lethal weapon is the mobile phone through the use of which data is instantly gathered by the imperialist governments and corporations. The use of mobile phones has spread like wild fire throughout non-Islamic state Muslim countries. Internet usage is also widespread in households , businesses , even in madrasas and mosques – Islamic groups and madrasas are offering IT training programs and encouraging the growth of web based businesses. All this enables the enemy – the imperialist governments and the information monopolist corporations – to constantly exercise surveillance over Islamic movements and Muslim societies.

It is therefore essential for Islamic groups and movements in non-Islamic state Muslim countries to avoid and discourage the use of the mobile phone and particularly information technology devices and apps in general. Conventional means of communication through face to face contact have played an important role in the success of the Afghan jihad. The Taliban leadership carefully monitored and limited the use of IT apps thus obstructing the provision of information to the enemy.

مقالۂ خصوصی

سید خالد جامعی

پاکستان میں مذہبی سیاست اور اسلامی تحریکیں

مسائل، امکانات اور خطرات

* جناب حافظ نعیم الرحمن صاحب کی فتح شکست میں بدل دی گئی۔ اسلامی جماعتوں کے لیے سوچ کے نئے زاویے۔

* مولانا مودودی نے کہا ’’جماعت اسلامی نے کبھی نہیں کہا کہ اسلامی انقلاب صرف جمہوری راستے سے ہی آسکتا ہے۔‘‘ (جسارت فرائیڈے اسپیشل ۷ مارچ، ۲۰۱۴ء، ص ۹۲)

امیر جماعتِ اسلامی بنگلادیش پروفیسر غلام اعظم نے کہا کہ ہمارے کارکنان یہ خیال کرتے ہیں کہ انتخابات کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا جبکہ جماعتِ اسلامی کی لیڈرشپ ایسا نہیں سمجھتی۔ اس راستے پر جانے سے فوج کو فائدہ ہوگا۔ (جسارت فرائیڈے اسپیشل ۱۳ر اکتوبر، ۲۰۱۴ء، ص ۸۱)

* اگر جمہوری عمل میں شرکت انقلابی عمل ہے تو پاکستان کی تمام مذہبی، سیاسی جماعتیں انقلابی ہیں۔ مذہبی سیاست کی جدوجہد کے حوالے سے چند اہم اشارات۔

* جماعت اسلامی بنگلادیش کے امیر غلام اعظم نے کہا کہ ہم ایک جہادی جماعت ہیں لیکن بنگلادیش کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ ہم کسی جگہ جہاد پر اپنے کارکنوں کو نہیں بھیج سکتے۔

* منور حسن نے کہا ’’سب سن لیں، مَیں ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہا ہوں ہمارے مسائل صرف جمہوریت اور انتخابات سے حل نہ ہوں گے اس کے لیے ہمیں جہاد اور قتال کا کلچر عام کرنا پڑے گا۔‘‘ (ڈاکٹر حسین احمد پراچہ کا کالم جنگ کراچی ۷ ۲ نومبر ۲۰۱۴ء)۔ بعد میں منور حسن صاحب نے اس بیان کی کچھ وضاحت فرمائی۔

* سراج الحق صاحب نے کہا ’’ہمارے یہاں ایمان، تقویٰ اور جہاد کے ماٹو والی فوج ہے ایک اسلامی فوج ہے۔‘‘ دوسرے معنوں میں فوج، اسلام اور پاکستان ایک دوسرے کے

متبادل ہیں۔فوج ہے تو اسلام بھی ہے اور پاکستان بھی ہے۔ دوسرے معنوں میں فوج اور اسلام متبادل اصطلاحات ہیں اور فوج ہی کی وجہ سے اسلام محفوظ ہے۔

* جماعت اسلامی دنیا بھر میں جہادی تحریکوں کی حامی تھی۔اس کے ہزاروں کارکنان بوسنیا، کشمیر، افغانستان، چیچنیا جہاد کے لیے گئے اور شہید ہوئے لیکن ۲۰۱۴ء میں جماعت اسلامی نے اپنی پالیسی تبدیل کی اور سراج الحق نے کہا۔ جماعت اسلامی اور عالمی اسلامی تحریکیں اعلان کرتی ہیں کہ عالم اسلام میں تبدیلی کا عمل صرف پُرامن طریقے سے انتخابات اور ووٹ کی پرچی سے ممکن ہے۔ (جسارت ص ۷، ۲۵ نومبر، ۲۰۱۴ء)

* منور حسن نے کہا لوگوں کے ووٹ دینے کے پیمانے الگ ہیں، انتخابات بیچ دیئے جاتے ہیں، انجینئر ڈ ہوتے ہیں، معاشرہ ظالم ترین لوگوں کی گرفت میں ہے، برادری نسل پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ (جسارت نومبر ۲۰۱۴ء صفحہ نمبر ۴)

* جمہوریت کو ایک آلے کے طور پر استعمال کرنے اور اسے الحق، زندگی، مقصد، منزل، ہدف سمجھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے جمہوریت حکمتِ عملی ہوسکتی ہے حکمتِ آسمانی نہیں ہوسکتی۔

----

* کیا مذہبی دینی جماعتوں کے لیے انتخابی سیاست کے ساتھ ساتھ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کو اس سوال پر غور کرنا چاہیے۔

* کیا جمہوری سیاست کو تجربات کی روشنی میں عارضی طور پر ترک کیا جا سکتا ہے؟

* انتخابی سیاست سے انحراف کا صرف ایک ہی مطلب کیوں سمجھا جاتا ہے یعنی عسکری جدوجہد۔ گویا دنیا میں جدوجہد کے صرف دو ہی راستے ہیں جمہوری عمل یا عسکری محاذ۔

* یہ نقطۂ نظر کہ جدوجہد دو ہی طریقوں سے ممکن ہے اصولِ استقراء کا نتیجہ ہے اور منطق میں استقراء یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔ جدوجہد کے سینکڑوں طریقے ہیں۔

* اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار میں علماء نے مختلف طریقوں سے جدوجہد کو جاری رکھا۔ حالات کے لحاظ سے اپنی حکمت عملی تبدیل کرتے رہے اور اسلامی

علمیت کو ہر سطح پر محفوظ اور ہر جگہ قائم بھی رکھا۔ کیا اس منہاج کو اختیار نہیں کیا جا سکتا؟

* یہ تصور درست نہیں ہے کہ تبدیلی کا عمل اوپر سے آتا ہے۔ تاریخی، روایتی، اسلامی تہذیب میں تبدیلی کا عمل نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ تاتاریوں کو اسی طریقے سے شکست دی گئی۔ کیا حضرت مجدد الف ثانیؒ کی کوششیں جدوجہد کے نئے راستے متعین کرتی ہیں؟

* جمہوری عمل سے باہر نکلنے کا مطلب عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ اب عسکریت ہی آخری راستہ ہے حالانکہ یہ نتیجہ اخذ کرنا منطقی مغالطہ ہے یہ نتیجہ اصولِ استقراء سے اخذ کیا گیا ہے اور استقراء کبھی یقین کا فائدہ نہیں دیتا۔ ایک اور مغالطہ یہ بھی ہے کہ آپ جمہوریت کی مخالفت کریں تو آپ کو آمریت کا حامی سمجھا جاتا ہے، جو غلط ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ جمہوریت اور آمریت دونوں کے خلاف ہوں، لیکن عصر حاضر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا سوچنا ممکن نہیں۔

* مذہبی، دینی جماعتوں نے بعض مرتبہ انتخابی عمل کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا، مگر یہ فیصلہ دینی جماعتوں کے لیے کوئی خوشخبری نہیں لا سکا۔ کیا کوئی اور راستہ بھی ہے؟

☆ بعض اسلامی تحریکیں سمجھتی ہیں کہ جدید ریاست اور اس کے اداروں اور نظام کو انقلاب کے بغیر تبدیل نہیں کیا جا سکتا جس کے لیے قلیل المدت، اور طویل المدت حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدید ریاست ایک پر تشدد وجود ہے، اس کے خاتمے کے لیے جوابی تشدد ضروری ہے۔ ترکی کے نجم الدین اربکان سیاسی جمہوری جدوجہد سے بالکل مایوس ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس کا ان کے خلاف فیصلہ تھا۔ ادارے کی ویب سائٹ پر یہ فیصلہ دیکھا جا سکتا ہے۔

Rafah Vs Turkey

کیا اسلامی جماعتوں نے کبھی یہ فیصلہ پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہے؟ جمہوریت کا حقیقی چہرہ یہ فیصلہ بتاتا ہے۔ اس فیصلے میں لکھا گیا ہے کہ جمہوری انتخابات کے ذریعے منتخب ہو کر اسلام نافذ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ اسلام جمہوریت کے عقیدۂ مساوات کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ افراد میں فرق قائم کرتا ہے۔

* کیا عصرِ حاضر میں ریاست کے اندر کوئی دینی جماعت ایک متبادل قوت نہیں بن

سکتی؟ صوبہ سرحد کے مولانا عبدالرحیم پوپلزئی نے گزشتہ ۲۳ سال سے چاند کی رویت کے فیصلے پر اپنی رِٹ ریاست کی رٹ کے مقابلے میں قائم کر رکھی ہے۔ پورے ملک میں عید مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق ہوتی ہے لیکن صوبہ سرحد میں عید مولانا پوپلزئی کے اعلان کے مطابق ہوتی ہے۔ پوپلزئی صاحب کو یہ مقام اور مرتبہ کیسے حاصل ہوا؟ کیا اسلامی قوتیں اس مثال کو اپنے لیے مشعلِ راہ نہیں سمجھ سکتیں؟ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے اراکین پاکستان کی ریاست سے ہمیشہ مطالبہ کرتے رہے کہ صوبہ سرحد میں ریاستی رِٹ قائم کی جائے، پوپلزئی صاحب کی رِٹ کا قوت سے خاتمہ کر دیا جائے لیکن ریاست کچھ نہیں کر سکی۔ حیرت ہے کہ علماء پوپلزئی صاحب کی رٹ کا مفاہمانہ جائزہ لینے اور اس سے روشنی حاصل کرنے کی بجائے وہ ان کی رِٹ کے خاتمے میں مصروف رہے۔ پوپلزئی صاحب کا ماڈل بے شمار مقامات پر آج بھی نہایت کامیابی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

٭ جنرل باجوہ نے اعلان کیا تھا کہ ۲۲ فروری ۲۰۲۳ء کے بعد فوج کا سیاست سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے گا لیکن عمران خان کی جماعت کا تتر بتر ہونا فوج کے بغیر ممکن نہیں۔ نعیم الرحمن صاحب کی شکست کا بھی یہی مطلب ہے کہ فوج آج بھی سیاست میں ملوث ہے۔ جماعتِ اسلامی نے عمران خان سے اس وقت حمایت حاصل کی جب PTI والے عمران خان کو چھوڑ کر جا چکے تھے۔ عمران کی حمایت ایک سیاسی عمل تھا۔ کراچی جیسے شہر میں عمران خان کو ایک سیاسی قوت کے طور پر کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا؟ لہٰذا حافظ صاحب کو تمام قوت کے باوجود سرنگوں کر دیا گیا۔

٭ جنرل باجوہ کے اعلان سے معلوم ہو گیا کہ پاکستان کی ستر سالہ سیاست فوج کی دخل اندازی کے ذریعے کام کر رہی ہے اس دخل اندازی کا نقطۂ عروج معین قریشی کی بحیثیت وزیرِ اعظم امریکہ سے درآمد (Import) تھی، ان کے پاس شناختی کارڈ بھی نہیں تھا، انہیں لایا گیا، وہ وزیر اعظم بنے IMF اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پلان قوم پر مسلط کیا اور تین ماہ بعد روانہ ہو گئے یہ تمام کام عسکری حلقوں کی نگرانی میں ہوا۔ اختیار و اقتدار کے تمام مراکز جب فوج کے پاس ہیں تو جمہوری جدوجہد کا کیا فائدہ؟ جب فوج ہی طے کرتی ہے کہ بھٹو کو لانا ہے، بھٹو کو ہٹانا

ہے نواز شریف، عمران خان کو لانا اور ان کو نکالنا ہے تو اس عمل کو جمہوری عمل کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اور ایسے جمہوری عمل میں اسلامی جماعتوں کی شرکت کا کیا فائدہ ہے؟ اسلامی جماعتوں کی ستر سالہ جدوجہد بے فائدہ رہی اور آئندہ بھی اس جدوجہد کی کامیابی کے امکانات محدود ہیں۔

* ایک رائے یہ بھی ہے کہ PTI, PML,PPP وغیرہ فوج کی حمایت سے اقتدار میں آ سکتے ہیں تو اسلامی جماعتیں فوج سے اقتدار حاصل کرنے کے لیے بات چیت کیوں نہیں کر سکتیں؟ اگر اقتدار میں آنا ضروری ہے تو فوجی حمایت حاصل کرنے میں کیا حرج ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی کامیابی کیا اسلامی جماعتوں کے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے گی؟ فوج جب کسی کو اقتدار دیتی ہے تو اس کے ہاتھ میں مطالبات کی ایک طویل فہرست بھی تھما دیتی ہے۔ کیا دینی جماعتیں یہ مطالبات مان لیں گی؟

* میئر کراچی کے الیکشن کے بارے میں بھی یہی کہا گیا کہ جماعتِ اسلامی نے غلط وقت پر غلط آدمی سے رابطہ کیا۔ وہ فوج سے رابطہ کر لیتی تو کامیابی کے امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔ جب ریاست عمران خان کے خلاف پوری قوت سے کاروائی کر رہی تھی اس وقت عمران خان کی حمایت کا حصول کیا درست سیاسی حکمتِ عملی تھی؟

* ایک رائے یہ بھی ہے کہ اسلامی جماعتیں پچیس سال کے لیے جمہوری جدوجہد سے الگ ہو جائیں، اس عرصے میں اپنے تمام کاموں کا گہرا ناقدانہ جائزہ لیں، نئی حکمتِ عملی مرتب کریں۔ ڈاکٹر اسرار نے جماعت اسلامی کو پیش کش کی تھی کہ اگر جماعت ۲۵ سال کے لیے جمہوری جدوجہد ترک کر دے تو وہ تنظیمِ اسلامی کو جماعت میں ضم کر دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ پچیس سال سیاست سے الگ ہو جانا کامیابی کی ضمانت ہے؟ ان پچیس سالوں کی حکمتِ عملی کیا ہوگی؟ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔

* کیا جمہوری عمل کے متبادل قوت و اختیار کے راستے موجود ہیں؟ راستے تو موجود ہیں لیکن اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور مذہبی سیاسی جماعتیں اس محنت کے لیے تیار نہیں۔ وہ فوری طور پر اپنی محنت کا صلہ ووٹ کے ذریعے مانگتی ہیں جو انہیں نہیں ملتا۔

* ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ پاکستان کے عوام تو اسلام چاہتے ہیں مگر حکومت، ریاست، طاقت کے دیگر ادارے اسلامی ریاست نہیں چاہتے لہٰذا یہ انتخابی عمل میں دھاندلی کر کے مذہبی سیاسی جماعتوں کو جعلی طریقے سے ناکام کرتے ہیں۔ اگر دیانت دارانہ الیکشن ہوں اور ایماندارانہ طریقے اختیار کئے جائیں تو مذہبی جماعتوں کو بھاری اکثریت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کے اقتدار میں آئے بغیر دیانت دارانہ الیکشن کیسے ممکن ہیں؟ اور جب وہ اقتدار میں نہیں آئیں گی تو دیانت دارانہ الیکشن کون کرائے گا؟

* ۱۹۷۰ء سے لے کر ۲۰۱۸ء کے الیکشن تک تمام سیاسی مذہبی جماعتوں کے ووٹ بینک میں نمایاں ترین کمی دیکھی گئی ہے۔ اس کمی کی کیا وجوہات ہیں؟ کیا مذہبی جماعتوں نے اس پر کبھی غور کیا ہے؟ اس وقت ان کا دائرہ صرف ایک نکاتی احتجاجی جدوجہد ہے۔ کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس ایک نکتے، مسئلے کو لے کر احتجاج شروع کر دیتی ہیں پھر یہ احتجاج بھی رفتہ رفتہ ختم ہو جاتا ہے، اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیا مسلسل احتجاجی جدوجہد سے عوام کی بڑی تعداد مذہبی جماعتوں میں شامل ہو جاتی ہے یا مذہبی سیاست سے الگ ہی رہتی ہے؟

* کیا مذہبی جماعتوں کو یہ نہیں معلوم کہ جمہوریت میں احتجاجی جدوجہد جمہوری عمل کا حصہ ہے۔ کوئی جماعت ساری زندگی حکومت کے خلاف پرامن احتجاج کرے تو ریاست کبھی اس احتجاج پر پابندی نہیں لگائے گی۔ ریاست جانتی ہے کہ احتجاجی جدوجہد چند ہفتوں سے زیادہ نہیں چلتی۔ لوگ مایوس ہو جاتے ہیں، جدوجہد کرنے والے اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ کینیڈا میں وہاں کے اصل مقامی باشندوں (Indigenous peoples) کی جماعت اپنے حقوق کے لیے دس سال سے احتجاجی جدوجہد کر رہی ہے۔ پارلیمنٹ کے سامنے ان کا شامیانہ دس سال سے لگا ہوا ہے جہاں وہ اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ ریاست انہیں کچھ نہیں کہتی کہ یہ پرامن جدوجہد ہے۔ اس سے جمہوری عمل اور زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ ریاست اس عمل سے مضبوط ہوتی ہے، ادارے مستحکم رہتے ہیں اور ناراض لوگ اپنی ناراضگی کا اظہار کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جدوجہد اگر پرتشدد ہو تو نتیجہ نکل آتا ہے مثلاً امریکہ میں کالوں نے اپنے حقوق کے لیے پرتشدد مظاہرے کیے اور

امریکہ کو بند کر دیا تو حقوق مل گئے۔ امریکہ کے لوگوں نے برطانیہ سے جنگ کی تشدد کیا تو امریکہ آزاد ہو گیا۔ یوروپی ممالک میں ہر سال قرآن کی رسالت مآب (ﷺ) کی توہین ہوتی رہتی ہے لیکن پر تشدد مظاہرے نہیں ہوتے۔ اگر دس بیس پر تشدد مظاہرے ہوں تو ریاست لاء اینڈ آرڈر کی خاطر، امن کے لیے، معاشی سرگرمیوں کی بحالی کے لیے توہینِ رسالت پر پابندی لگا سکتی ہے مگر وہاں کے مسلمان پر امن مظاہرے کرتے ہیں۔

* تقسیمِ ہند کے وقت سے علماء اور مذہبی سیاسی جماعتوں نے سیاست میں حصہ لینے کا آغاز کیا۔ آج ایک صدی کے بعد کیا وہ ایک لمحے کے لیے رک کر یہ سوچنے پر تیار ہیں کہ اس طویل سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں کیا ان کی منزل قریب آئی ہے یا اور دور ہو گئی ہے؟ کیا ان مذہبی جماعتوں اور علماء کی قوت میں زبردست اضافہ ہوا ہے یا زبردست کمی ہوئی ہے؟ ۱۹۴۸ء میں پاکستان میں دینی مدرسوں کی تعداد بہت کم تھی مگر علماء کی قوت بہت زیادہ تھی آج دینی مدارس ہزاروں کی تعداد میں ہیں لیکن علماء کی قوت کم ہوئی ہے کیوں کہ اب ایک اہم ترین مسئلہ ادارے کو بچانا ہے اور ادارے کو بچانا بھی اسلام ہی کا کام ہے۔ یہ مسائل ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور ان کا حل نکالنا بھی علماء کی ذمہ داری ہے۔

* پاکستان کی تمام مذہبی جماعتوں کے فوج کے ساتھ قریبی اور مثالی تعلقات ہیں۔ اس تعلق کی مذہبی دلیل مذہبی قوم پرستی کے ذریعے نکالی گئی ہے کہ اسلام کا مطلب پاکستان ہے اور پاکستان کا مطلب اسلام۔ اسلام کی محافظ فوج ہے لہٰذا پاکستان، فوج اور اسلام تینوں میں کوئی فرق نہیں۔ فوج کی حمایت دراصل اسلام ہی کی حمایت ہے۔ اس دلیل کے ذریعے پاکستان میں مذہبی قوم پرستی کو جواز مل گیا ہے۔ لبرل اور سیکولر حلقے فوج کے شدید مخالف ہیں لیکن ریاست ان کے خلاف کوئی سخت کاروائی نہیں کرتی کیوں کہ عالمی طاقتیں NGO'S, UNO، لبرل ادارے ان کی پشت پر ہیں۔ لیکن اسی فوج نے افغانستان پر امریکی حملے کے بعد مدارس کے طلباء، علماء کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جبکہ یہ سب فوج کے حلیف تھے۔ فوج نے اپنے حلیفوں سے مذاکرات نہیں کئے، اس کی کیا وجہ تھی؟ اگر مذہبی سیاسی جماعتیں اس نکتے پر غور کر لیں تو بہت سے حقائق ان پر منکشف ہوں گے۔ جہاں مذاکرات ہوئے وہاں

مذاکرات بے نتیجہ رہے۔ مولانا فضل الرحمان نے کہا کہ دینی مدارس کے طلباء کو کلاشنکوف فوج نے پکڑائی تھی۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ اس وقت کیا کر رہے تھے، آپ خاموش کیوں تھے؟ آپ نے اس بارے میں طلباء کی اور قوم کی کیا رہنمائی کی؟ مدارس کے ہزاروں طلباء کو غائب کیا گیا، سینکڑوں کو قتل کیا گیا مذہبی قیادت نے احتجاج تک نہیں کیا۔ لبرل نقیب اللہ محسود کو راؤ انوار نے غلطی سے مار دیا تو عالمی لبرل قوتوں نے اسے ملازمت سے برطرف کرادیا لیکن اس سپاہی نے دینی مدارس کے تین سولڑکوں کو شہید کیا تو اس کے خلاف پاکستان کی کسی دینی جماعت نے احتجاج تک نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ طلباء کو مارنے کی بجائے گرفتار کیا جاتا، ان سے بات چیت کی جاتی آخر پاکستانی فوج نے پاکستان دشمن جئے سندھ تحریک کو قبول کیا یا نہیں؟

* پاکستانی لبرل سیکولر حلقوں کی فوج پر سخت تنقید کے باوجود فوج ہمیشہ ان سے نرمی کا معاملہ کرتی رہی لیکن جہادی تحریکوں کے مذہبی رہنماؤں سے اس کا معاملہ بالکل مختلف تھا حالانکہ یہ جہادی تحریکیں ماضی میں فوج کی حمایت سے ہی آگے بڑھی تھیں۔ ان تحریکوں کے ساتھ فوج کا رویہ وہ نہیں تھا جو لبرل کے ساتھ تھا۔ لبرل حلقے مذہبی حلقوں پر ملٹری ملا اتحاد کی پھبتی کستے ہیں۔ فوج سے اتنے قریبی تعلق کے باوجود فوج نے آج تک مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں کو اقتدار میں آنے کا کوئی راستہ کیوں نہیں دیا؟

* جماعتِ اسلامی نے نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے لیے جنرل یحییٰ خان اور ضیاء الحق کی حمایت کی۔ مشرقی پاکستان میں ڈاکٹر مالک کی فوجی کابینہ میں جماعت اسلامی کو تین وزارتیں دی گئیں۔ ضیاء الحق کی کابینہ میں جماعت اسلامی کو تین اہم وزارتیں دی گئیں لیکن جماعت اسلامی نے جلد استعفیٰ دے دیا۔ فوج سے اس قریبی تعلق کے باوجود فوج نے جماعت اسلامی کو یا کسی بھی مذہبی سیاسی جماعت کو ابھی تک PTI,PPP اور PML کا متبادل کیوں نہیں سمجھا؟ اس ایک نکتے پر اگر غور کر لیا جائے تو بہت سے راز کھل جائیں گے، حقائق بے نقاب ہو جائیں گے۔

شریعت جدید ریاست کے تابع ہے

* ایک محترم مکرم مفتی صاحب نے ایک مرتبہ اپنے بیان میں کہا تھا کہ پاکستانی

ریاست جب بھی کسی مشکل میں ہوتی ہے تو ہم سے رجوع کرتی ہے لیکن جب مشکل وقت نکل جاتا ہے تو وہ ہم سے بات کرنے کی بھی روادار نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ ریاست مشکل وقت میں آپ کو مدد کے لیے پکارتی ہے تو آپ ریاست کی مشکل آسان کرنے کے لیے کیوں پہنچ جاتے ہیں؟ یہی تو وہ وقت ہے جب آپ ریاست سے دوٹوک بات کر سکتے ہیں۔ ریاست کو 'پیغام پاکستان' کے نام سے فتویٰ لینا تھا تو وہ علماء کے قریب آ گئی۔ علماء نے فتویٰ بھی دے دیا کہ ریاست کو جہاد کا حق حاصل ہے کسی مذہبی گروہ، منظم جتھے کو جہاد کا حق حاصل نہیں، مگر وہ یہ بھول گئے کہ آئین پاکستان میں جہاد کی اصطلاح سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ آئین کی دفعہ ۲۴۵ میں ریاست نے فوج کو صرف اور صرف دفاعِ پاکستان کا حق دیا ہے یعنی کسی جارحیت کے خلاف (Defense of Pakistan)۔ فوج وطن کی سرحدوں کا دفاع کرے گی۔ آئین بتا رہا ہے کہ جدید ریاست، آئینی ریاست جہادی ریاست نہیں ہوتی، نہ وہ جہاد کرتی ہے، نہ اس کا مقصد جہاد ہوتا ہے۔ جہاد ایک مذہبی امارت کا مسئلہ ہے جدید ریاست کا نہیں۔

جدید ریاست کی ماہیت، حیثیت اور حقیقت کیا ہے؟ مذہبی سیاسی جماعتوں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا۔ وہ جدید ریاست کی تخلیق پر غور کریں، مطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ امارت، بادشاہت، مملکت، سلطنت اور جدید ریاست میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جدید ریاست خدا کی جگہ لیتی ہے اور ریاست کے شہریوں کو اپنا بندہ تصور کرتی ہے۔ تمام بندوں کو ریاست کے احکامات کی پابندی کرنی ہے۔ ریاست تمام قوتوں، نظاموں پر بالادست ہے۔ شریعت بھی ریاست کے تابع ہے۔ ریاست شریعت کے تابع نہیں۔ ریاست آئین دیتی ہے لیکن ریاست جب چاہے آئین اور قانون کو معطل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اسلامی امارت میں کوئی حکمران شریعت کو معطل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ حیرت ہے کہ مذہبی جماعتوں نے جدید ریاست کو خلافتِ عثمانیہ کا متبادل سمجھا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے جو بے شمار غلطیوں کا سبب بن رہی ہے۔ جدید ریاست اٹھارویں صدی کی مغربی ایجاد ہے، یہ اپنی سرشت میں سیکولر ہوتی ہے۔ یہ قادرِ مطلق (Sovereign) ہوتی ہے۔ سب اس کے زیر دست ہوتے ہیں، کوئی اس پر بالادست نہیں ہو سکتا۔ دین شریعت سب ریاست کے تابعدار ہوتے ہیں۔ ریاست جب چاہے شریعت کو بھی معطل کر سکتی ہے۔ کورونا میں یہی ہوا۔ مساجد بند کر دی گئیں۔ پیدا ہونے

والا بچہ جدید ریاست کا شہری پہلے ہے اور اس کے بعد کسی کا بیٹا ہوتا ہے۔ اصولِ استثناء State of Exception صرف اور صرف ریاست کو حاصل ہے۔ Carl Schmitt جو ریاست کا بہت بڑا فلسفی ہے لکھتا ہے کہ جس طرح خدا معجزے کے ذریعے کائنات کے نظام میں تعطل پیدا کرکے اپنے وجود کا اظہار کرتا ہے جدید ریاست بھی آئین اور قانون کو معطل کر کے خدا کی طرح اپنی قوت کا اظہار کرتی ہے۔ کورونا کے زمانے میں دنیا کی کسی پارلیمنٹ سے نہیں پوچھا گیا کہ سماجی فاصلہ کتنا رکھا جائے؟ جدید ریاست نقاب الٹ کر سامنے آ گئی اور اس نے تمام پابندیاں لگا دیں۔ انسانی حقوق کے تحت انسانوں کو دی گئی فریڈم ریاست نے چھین لی۔ فریڈم کا مطلب ہی یہ ہے کہ بس ریاست کے احکامات کی پیروی کرو تمھیں اسی کام کی آزادی ہے۔

جدید ریاست کو مذہبی چہرہ قبول نہیں

* MMA (ایم ایم اے) نے مشرف دور میں قومی اسمبلی کی کثیر نشستیں حاصل کیں۔ مولانا فضل الرحمان کو وزیراعظم نامزد کیا۔ انھیں دیگر سیاسی جماعتوں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ ان کی کامیابی کے سو فیصد امکانات تھے جس طرح حافظ نعیم الرحمن کی کامیابی کے سو فیصد امکانات تھے۔ جنرل مشرف نے فضل الرحمان صاحب کو پیغام دیا کہ وہ وزیراعظم کے عہدے پر الیکشن نہ لڑیں۔ وجہ یہ تھی کہ مغرب کو مولانا فضل الرحمان کا چہرہ یعنی داڑھی ٹوپی عمامہ پسند نہیں تھا۔ مشرف صاحب پاکستان کی وزارت عظمٰی کے عہدے پر ایک مذہبی چہرے کو دیکھنے کے روادار نہیں تھے لہٰذا انھیں بھاری اکثریت ہونے کے باوجود الیکشن میں ہرا دیا گیا مشرف صاحب نے جو کچھ کیا وہ جدید ریاست کا حقیقی تقاضا تھا۔ مشرف صاحب نہ ہوتے کوئی اور بھی ہوتا تو فیصلہ یہی ہوتا۔ حیرت ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتوں نے اس اقدام کا تحقیقی تنقیدی جائزہ نہیں لیا اس کی روشنی میں اپنی سمت سفر طے نہیں کی۔ فوج نے بتا دیا کہ مذہبی قیادت سیاسی قیادت اور منصب کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ اگر مذہبی جماعتیں ابھی تک یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں تو ہمیں حیرت ہے۔

جماعت اسلامی کامیاب نہیں ہوسکتی

* کیا جماعتِ اسلامی جمہوری جدوجہد کے ذریعے کبھی کامیابی حاصل کرسکتی ہے؟

ہمارا جواب ہے کہ نہیں۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ترکی میں اردگان نے اسلامی قوتوں کی مدد سے کامیابی حاصل کی تو جماعت اسلامی کو کامیابی کیوں نہیں مل سکتی؟ جواب یہ ہے کہ ترکی اور پاکستان کی مذہبی فضاء میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہاں اعتقادی مسائل درپیش نہیں ہیں اور اردگان کو تمام اسلام پسند حلقوں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ جماعت اسلامی کو اعتقادی مسائل کا سامنا ہے۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، تبلیغی جماعت والے جماعت اسلامی کے عقائد کو درست نہیں سمجھتے لہٰذا مذہبی حلقوں کے ووٹ جماعت کو نہیں ملتے۔ جب تک جماعت اسلامی دیوبندی بریلوی حلقوں سے اعتقادی مسائل کے حل پر بات نہیں کرتی مسائل موجود رہیں گے۔ قاضی حسین احمد نے اپنے دورِ نظامت میں مولانا زاہد الراشدی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مولانا مودودی کی قابلِ اعتراض باتوں کو ان کی کتابوں سے نکال دیں گے لیکن یہ وعدہ پورا نہ ہوا پاکستان کی تمام مذہبی جماعتوں کو ایک قوت بننے کے لیے اعتقادی سطح پر اپنے اختلافات ختم کرنا ہوں گے ان اعتقادی اختلافات کو ختم کئے بغیر کوئی بھی مذہبی سیاسی جماعت جمہوری جدوجہد سے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور اگر کامیاب بھی ہو جائے تو مصر، الجزائر، فلسطین اور اب جناب حافظ نعیم الرحمن ہمارے سامنے ہیں۔ ترکی میں بائیں بازو کے غلبے کے خوف سے اردگان کو قبول کیا گیا ورنہ وہاں بھی مصر والا معاملہ ہوتا۔ رسالہ New Left میں ایک اہم مضمون NATO Islamists پڑھیے۔ طیب اردگان دارالحرب یورپی یونین کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے جو کچھ کرتے رہے وہ سب تاریخ کا حصہ ہے، ہم اسے فراموش نہیں کر سکتے۔

پاکستان میں کوئی اسلامی انقلابی جماعت نہیں

* سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر جمہوری تجربہ کامیاب نہیں ہے تو کیا چین، فرانس، امریکہ، روس، جرمنی، ایران کے انقلابات کا تجربہ پاکستان میں نہیں کیا جا سکتا؟ کیا حزب التحریر کی طرح فوج کو اسلامی انقلاب کا حامی نہیں بنایا جا سکتا؟ کیا فوج سے محاذ آرائی کے بغیر اقتدار کے ایوان میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟ انقلابات کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انقلاب یا تو فوج کی حمایت سے ممکن ہوتا ہے یا فوج کو شکست دے کر لیکن اس کے لیے ایک

انقلابی جماعت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ایک انقلابی منشور کی بھی۔ پاکستان کی تمام مذہبی سیاسی جماعتوں اور سیکولر جماعتوں کے انتخابی منشور میں کوئی فرق نہیں، سب روٹی کپڑا اور مکان کی بات کرتے ہیں۔ انقلابی جماعت لوگوں کو ان خواہشات سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ ایمی چوا نے اپنی کتاب *The World On Fire* میں خمینی صاحب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم نے انقلاب تربوز کی قیمت کم کرنے کے لیے برپا نہیں کیا۔ خمینی صاحب کے اس جملے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انقلاب آئے گا تو لازماً تربوز کی قیمت چڑھے گی۔ وہ صرف یہ بتا رہے ہیں کہ انقلاب دلوں کی دنیا بدلنے کے لیے آتا ہے، معاشی، مالی، مادی خواہشات ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے لیے انقلاب کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ انقلاب لانے والوں کو انقلاب قائم رکھنے کے لیے بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں کیا پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتوں میں فی الواقع کوئی حقیقی انقلابی جماعت موجود ہے؟ جماعت اسلامی کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک انقلابی جماعت ہے لیکن مسلسل دستوری سیاسی جمہوری جدوجہد میں مصروف ہے لہٰذا اگر انقلابی جماعت کا یہی مقصد ہے تو مولانا فضل الرحمان کی JUI، مولانا نورانی کی JUP، مرکزی جمعیت اہلحدیث، علامہ خادم رضوی صاحب کی TLP تمام انقلابی جماعتیں ہیں کیوں کہ تمام مذہبی جماعتوں کے نعرے، رویے، مقاصد، منشور، اقدامات، لائحہ عمل، راستے جمہوری سیاست کے کوہِ ندا کی طرف ہی جاتے ہیں۔ جمہوریت میں انقلاب نہیں آتا بلکہ جدید ریاست غالب سرمایہ دارانہ نظام اور غالب علمیت سے مصالحت ہوتی ہے اور اسی نظام کی اصلاح کی جاتی ہے جسے باطل بھی کہا جاتا ہے۔

مخلص اور نیک لوگ نیک جماعتیں جب اخلاص سے جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح کا کام کرتی ہیں تو اس سے سرمایہ دارانہ نظام کمزور نہیں ہوتا بلکہ طاقت ور ہوتا ہے انقلاب تو نظام کو کمزور کرنے بلکہ گرا دینے کا نام ہے نہ کہ اسے طاقت ور کرنے کا۔ ہمیں تو حیرت اس بات پر ہے کہ مختلف سیاسی مذہبی جماعتوں، تحریکوں نے جو اسلامی سکول کھول رکھے ہیں ان میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں۔ جو تعلیم لڑکے کو دی جا رہی ہے وہی تعلیم لڑکی کو دی جا رہی ہے۔ ۲۲ سال کی تعلیم کے بعد ایک لڑکی PhD کرتی ہے تو اسے قرآن

کی آیت سے بتایا جاتا ہے کہ "قرن فی بیوتکن "عورت کا اصل مقام تو اس کا گھر ہے، اس کا خاندان ہے، اس کے شوہر اور بچے ہیں۔ وہ سوال کرتی ہے کہ میری زندگی کے ۲۲ سال کیوں ضائع کئے گئے؟ مجھے امورِ خانہ داری، خاندانی تعلقات، پکوان، بچوں کی نگہداشت کی تعلیم کیوں نہیں دی گئی؟ میں تو اب نوکری کروں گی۔ مَیں گھر نہیں سنبھال سکتی۔ اس کے نقطۂ نظر کا جواب صرف خاموشی ہے۔ انقلابی جماعت خاموش نہیں رہتی، وہ صورت حال کا جائزہ لیتی ہے، غلطی کی اصلاح کرتی ہے، کمزوریوں کو دور کرتی ہے اور اسلامی علمیت کے مطابق ایک مضبوط مؤقف اختیار کرتی ہے، اس پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کی تاریخ سمجھوتوں کی تاریخ ہے جبکہ سمجھوتوں سے کبھی انقلاب برآمد نہیں ہوتا۔

کیا عسکری جدوجہد کے سوا تمام راستے بند ہو چکے ہیں؟

جماعت اسلامی کو یہ یاد نہیں رہا کہ ان کے قائد مولانا مودودی نے طاہر مسعود کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''جماعت اسلامی نے کبھی نہیں کہا کہ اسلامی انقلاب صرف جمہوری راستے سے ہی آ سکتا ہے''۔ (جسارت فرائیڈے اسپیشل ۷ مارچ، ۲۰۱۴ء، ص ۹۲)

امیر جماعت اسلامی بنگلا دیش پروفیسر غلام اعظم نے کہا ہمارے کارکنان یہ خیال کرتے ہیں کہ انتخابات کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا۔ جبکہ جماعت اسلامی کی لیڈر شپ ایسا نہیں سمجھتی کیونکہ اس راستے پر جانے سے فوج کو فائدہ ہوگا۔ (جسارت فرائیڈے اسپیشل ۱۳ اکتوبر، ۲۰۱۴ء، ص ۸۱)

سوال یہ ہے کہ عسکری جدوجہد کے سوا دوسرے تمام راستے بند ہو چکے ہیں اس سوال پر بار بار غور کی ضرورت ہے۔

* اسلامی تاریخ میں تبدیلی کے بہت سے طریقے ہیں۔ ترکانِ عثمان کا طریقہ، مغل سلطنت کے قیام کا طریقہ، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ کا طریقہ، اصحاب الاخدود کا طریقہ، ایران میں انقلاب کا طریقہ، کیوبا میں کاسترو کا طریقہ۔ کیوبا امریکہ سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے لیکن اس نے امریکی غلامی قبول نہیں کی حالانکہ امریکہ اور کاسترو دونوں مادہ پرست ہیں۔ آزادی، مساوات، ترقی دونوں کا عقیدہ ایک تھا

لیکن طریقہ کار مختلف تھا لہٰذا کاسترو اور امریکہ میں صلح نہ ہوسکی۔ کاسترو کی قوم نے شدید مالی، معاشی، مادی نقصانات اٹھائے لیکن امریکہ سے مفاہمت نہیں کی۔ امریکہ کا ایک ہی مطالبہ تھا صرف جمہوریت، کاسترو نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ کاسترو کسی قسم کی روحانیت کے بغیر ایک مادی قوت سے مادی سطح پر لڑتا رہا اور کامیاب رہا۔ کیوبا میں کاسترو ازم تھا، لوگ کاسترو سے محبت کرتے تھے اور اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔ امریکہ نے کاسترو پر پچاس حملے کرائے لیکن عوام حملوں کے وقت کاسترو کے سامنے آجاتے، وہ اسے بچا لیتے۔ کیا اسلامی تحریکوں کے کسی لیڈر کو عوام میں یہ مقبولیت حاصل ہے؟ کاسترو ازم اور وہاں کے عوام کے بارے میں نوم چومسکی نے اپنی کتاب The Profit میں جو معلومات مہیا کی ہیں وہ نہایت حیران کن ہیں۔ اسلامی تحریکیں اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

ایرانی انقلاب کیوں کامیاب ہوا؟

ایرانی انقلاب اس لیے کامیاب ہوسکا کہ علماء نے ستر سال تک بادشاہ کے خلاف مسلسل جدوجہد کی۔ علماء نے ریاستی عہدے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ وہ ریاستی دائرے سے باہر نکل کر اپنے علمی، عقلی، تاریخی، روایتی روحانی دائرے میں آ گئے۔ شہنشاہ کی مزاحمت وہ قربانیاں دے کر کرتے رہے۔ ایک اہم بات ان کا مسلک تھا۔ ان کے درمیان عقیدے اور مسلک کی بحث نہیں تھی۔ وہ اپنے مجتہدین سے محبت رکھتے تھے، ان کا حکم مانتے تھے لیکن انقلاب روحانیت کی بجائے مادیت کی طرف گیا۔ جمہوریت اور معیارِ زندگی اصل اقدار بنیں تو اب انقلاب تیزی سے تحلیل ہو رہا ہے۔ ایران میں ۲۰۲۳ء میں حجاب کے خلاف عورتوں کا احتجاج خطرناک مستقبل کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایران کے الیکشن میں ایک ہی مسئلہ، سوال تمام مذہبی رہنماؤں کے لیے اہم ہوتا ہے کہ مہنگائی کون کم کرے گا؟ تربوز کی قیمت کیسے کم ہوگی؟ یعنی انقلابِ اسلامی اب صرف سستی روٹی کا نام رہ گیا ہے۔ کوئی مادہ پرستی سے اوپر اٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ایرانی علماء نے ایرانی عوام کا معیارِ زندگی بہت بلند کردیا اب عیش کرنے والے عیش میں کمی کیسے برداشت کریں؟ ایرانی علماء کتنے متجدد ہو گئے ہیں کہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کئی علماء مارکس، ہیگل، لبرل ازم، عقلیت پرستی، جدیدیت کے حامی ہو گئے

ہیں اس کے لیے ایک کتاب پڑھیے:

The Voices Of Islam

اسلامی سیاسی جماعتیں دعوت کا طریقہ کیوں اختیار نہیں کرتیں؟

حافظ نعیم الرحمن کو شکست پی پی پی نے نہیں ان لوگوں نے دی ہے جو PTI کی تمام قیادت کو اڈیالہ جیل لے گئے، معافی نامے لکھوائے، جیل سے رہا کر کے سیدھا نیشنل پریس کلب لے گئے اور وہاں PTI سے لاتعلقی کا اعلان کراتے رہے۔ حافظ نعیم الرحمن کی شکست کا پیغام یہ ہے کہ جمہوریت کے ذریعے کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب آپ کے فوج سے سیاسی تعلقات ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جماعت اسلامی فوج کو قائل کرے کہ اقتدار کے اہل ہم ہیں؟ لیکن یہ ممکن نہیں ماضی میں فوج نے مولانا فضل الرحمان کو وزیراعظم کے عہدے پر اسی طرح شکست دی جس طرح حافظ صاحب کو دی گئی۔ اسلامی جماعتوں کو شکوہ ہے کہ عوام ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں مگر ووٹ نہیں دیتے۔ اسلامی جماعتیں تشہیر کے تمام جدید طریقے اختیار کرتی ہیں لیکن ان کے اجتماعات میں دس بیس ہزار اور لاکھ سے اوپر لوگ جمع نہیں ہوتے، اس کے برعکس دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں کسی پلاننگ اور پروپیگنڈے کے بغیر لاکھوں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کا طریقہ دعوت ہے جو سنت رسول سے نکلا ہے کہ ہر فرد کو دعوت دو۔ یہ کام انفرادی ہوتا ہے ادارتی نہیں۔ وہ فرد کے پورے وجود کو مخاطب کرتے ہیں لہٰذا لوگ اس دعوت کو قبول کرتے ہیں۔ کیا سیاسی اسلامی جماعتیں اس طریقے سے عوام کے اندر اثر و نفوذ اختیار نہیں کر سکتیں؟

دعوتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت Interpersonal Communication کو اختیار کرتی ہیں مذہبی سیاسی جماعتیں اس طریقے کو اختیار نہیں کرتیں وہ Mass Contact کے اصول پر چلتی ہیں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی، میڈیا، جلسوں کے ذریعے اپنی طاقت میں اضافہ کرتی ہیں لیکن عملاً ان کی قوت و طاقت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ تبلیغی جماعت اور دعوتِ اسلامی کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس کے لیے سیاست سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یہ ممکن نہیں۔ تو عوام تک پہنچنے کا ذریعہ کیا ہو اور ان کے دل میں اترنے کا راستہ کون بتائے؟

کیا دعوت اور سیاست کا عمل ایک ساتھ چل سکتا ہے؟

* ایک انتہائی اہم نوعیت کا سوال یہ ہے کہ دعوت اور سیاست کا عمل کیا ساتھ ساتھ چل سکتا ہے؟ داعی کسی اجر کا طالب نہیں ہوتا وہ اجر کی تمنا کے بغیر کام کرتا ہے۔ وہ عمل کی اجرت اس دنیا میں نہیں چاہتا۔ داعی کسی گروہ کا حریف نہیں ہوتا اگر وہ حریف ہے تو دعوت کا کام کیسے ہو؟ کیا دعوت اور سیاست میں تطبیق ممکن ہے، اگر ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہے؟ کیا یہ تجربہ دنیا میں کہیں کامیاب بھی ہے؟ پاکستانی سیاست میں سو انتخابی حلقے ایسے ہیں جہاں سے اسی برادری، قبیلے، گروہ، خاندان کا آدمی منتخب ہوتا ہے کسی سیاسی جماعت کو ان سو حلقوں میں کامیابی نہیں ملتی۔ انھیں Electable بھی کہا جاتا ہے۔ کیا مذہبی سیاسی جماعتیں ان سو لوگوں تک اپنی دعوت پہنچا کر انھیں اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتیں؟ آخر یہ انسان ہی ہیں۔ ان کے سامنے اگر مذہبی جماعتوں کا بے داغ کردار آ جائے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان لوگوں کے دلوں کو تسخیر نہ کیا جا سکے۔ ان سو لوگوں کے ذریعے دعوتِ دین کا کام بھی وسعت اختیار کر سکتا ہے۔ کیا ہماری جماعتوں نے اس موضوع پر کبھی سوچا ہے؟

سیاست اور جہاد ایک ساتھ

لبنان میں حزب اللہ ایک جانب سیاسی عمل میں شریک ہے دوسری جانب وہ اسرائیل سے عسکری مسابقت میں بھی پیش پیش ہے۔ سیاسی عمل میں اسے ایک مرتبہ بہت زیادہ نشستیں ملیں، اسے مخلوط حکومت بنانے کی پیش کش کی گئی لیکن حزب اللہ نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا کیوں کہ ملک کے معاشی حالات ایسے تھے کہ ان حالات میں حزب اللہ عوام کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کیا ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں نے کبھی اس حکمت عملی پر غور کیا ہے وہ تو ہر وقت عجلت میں اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے وہ یحییٰ خان اور ضیاء الحق کی فوجی کابینہ میں شریک ہو گئے تھے لیکن اس اقتدار سے انھیں کوئی فائدہ ہوا نہ ان کی سیاسی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔

سیاسی جدوجہد ہمیشہ فائدہ مند نہیں ہوتی

کبھی کبھی خاموش رہنا، الگ تھلگ رہنا، غیر جانب دار ہونا، سیاسی عمل سے دور رہنا بھی بے حد فائدہ مند رہتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کو مولانا مودودی نے تحفظ نظریہ پاکستان

کی جنگ قرار دیا۔ تحفظِ نظریۂ پاکستان فنڈ قائم کیا لیکن مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں جگہ تمام اسلامی جماعتوں اور جماعت اسلامی کو شکست ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو (جسے ملک دشمن کا خطاب دیا گیا) سو فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ یحییٰ خان نے ان انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا اور ڈاکٹر مالک کی سربراہی میں فوجی کابینہ قائم کی جس میں جماعت اسلامی کے دو وزراء شامل تھے۔ نئے انتخابات ہوئے جس میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو زیادہ نشستیں ملیں لیکن عوامی لیگ نے ان نتائج کو ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ اسے سو فی صد عوام کی حمایت حاصل تھی اور اس کی جمہوری کامیابی کو فوج نے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ریاست اور عوام کے درمیان شدید قسم کی نفرت پیدا ہوئی۔ خانہ جنگی کے آثار پیدا ہوئے۔ تبلیغی جماعت، خانقاہیں، مدارس، مساجد اس سیاسی عمل سے دور رہے وہ غیر جانب دار تھے انھوں نے تحفظِ نظریۂ پاکستان کے نعرے کو قبول نہیں کیا۔ اس نعرے کو مغربی اور مشرقی پاکستان میں شکست ہو چکی تھی دونوں بازوؤں میں پی پی پی اور عوامی لیگ کامیاب ہوئے جنھیں انتخابی مہم میں مذہبی سیاسی جماعتوں نے غدار قرار دیا تھا۔ لیکن کیا واقعی نظریۂ پاکستان شکست کھا چکا تھا ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک ملک میں غداروں اور ملک دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہی دکھایا جا رہا ہے مثلاً سب سے پہلے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو جہاد کشمیر پر غدار کا لقب دیا گیا، پھر باچا خان غدار بنے، پھر بلوچ رہنما نوروز خان کو غدار کہا گیا، پھر کمیونسٹ جو تحریکِ پاکستان میں مسلم لیگ کے حامی تھے وہ غدار ٹھہرے، پھر ایوب خان نے تمام سیاسی رہنماؤں کو غدار قرار دیا، ایبڈو لایا گیا، سیاست کی تطہیر کی گئی۔ پھر یحییٰ خان آ گئے انھوں نے بنگالیوں کو غدار قرار دیا۔ بھٹو صاحب نے بلوچ رہنماؤں، نیپ، ولی خان JUI مفتی محمود سب کو غدار قرار دیا۔ پھر ضیاء الحق آئے MRD,PPP دیگر سیاسی جماعتوں کو غدار کا خطاب ملا۔ سندھی قوم پرست بھی غدار قرار دئے گئے۔ پھر MQM اور مسلم لیگ کے نواز شریف غدار ہوئے۔ تحریک لبیک پاکستان کو غدار کہا گیا۔ پی پی پی اور مسلم لیگ کو غدار کہہ کر عمران خان کو لایا گیا۔ اب انھیں ملک کا سب سے بڑا غدار قرار دیا گیا ہے۔ ہر وہ گروہ، جماعت جو سیاسی عمل میں شریک ہے اور ریاست سے اختلاف رکھتا ہے وہ غدار کہلایا گیا۔ ریاست سے کیا مراد ہے؟ آج پورا پاکستان جانتا ہے کہ پاکستان میں ریاست کسے کہتے

ہیں۔تبلیغی جماعت، دینی مدارس، مساجد پر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مکتی باہنی نے غدار کا داغ نہیں لگایا کیوں کہ وہ سیاسی عمل سے باہر تھے جس کی وجہ سے مساجد، مدارس، خانقاہ محفوظ رہے اور بنگال میں دینی علمیت، دینی ادارے مؤثر طریقے سے اپنا کام کر رہے ہیں۔آج تو یوں لگتا ہے کہ پاکستان میں فوج کے سوا کوئی پاکستان کا وفادار نہیں اور پاکستان ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک بس خطرے میں ہے اور فوج بھی اس خطرے کو ٹال نہیں سکی۔

ہم جسے اب تک ناموسِ وطن کہے جاتے تھے کل بھی وہ خطرے میں تھی اور آج بھی خطرے میں ہے۔ یہ جائزہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ سیاسی عمل کی قیمت کا تعین کیا جا سکے۔ اس جائزے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ریاست اور سیاسی جماعتوں کی حکمتِ عملی کو غور سے دیکھا جائے اور مذہبی سیاسی جماعتیں نیا راستہ نکالیں۔اپنی تاریخ سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔تاریخ کے آئینے میں ہم سب کو اپنا چہرہ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

غلبۂ دین سے پہلے اصلاح عوام ضروری ہے

مولانا مودودی نے کئی جگہ یہ لکھا ہے کہ یہ مسلمان نام کے مسلمان ہیں۔مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کا نام مسلم ہے ورنہ اسلام سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں۔لہٰذا سب سے پہلے ان کی اصلاح کی ضرورت ہے جو دعوت دین کے ذریعے ہوگی۔عوام کی اصلاح کے بعد غلبۂ دین کا کام ہوگا۔انہوں نے مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی حالت پر نہایت سخت تنقید کی جس کا حاصل یہ تھا کہ اکثریت فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ستر سال پہلے مسلمانوں کی اخلاقی حالت اگر ایسی تھی تو آج کے مسلمانوں کی حالت ان سے بہتر ہے یا بدتر ہے تو کیا ہم ان فاسق و فاجر مسلمانوں کی قیادت کریں؟ انبیاء کرام علیہم السلام کی قرآن کریم میں دعا ہے کہ اے رب ہمیں متقین کا امام بنا۔کیا اس دعا پر عامل ہونا چاہیے یا نہیں؟

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝۷۴﴾ [الفرقان ۲۵:۷۴]

ترجمہ: اور وہ جو (اللہ سے) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں

کا امام بنا۔

جماعت اسلامی کو کارِ دعوت کی طرف لوٹنا چاہیے

جماعت اسلامی نے پنجاب کے صوبائی انتخابات میں پہلی بار حصہ لیا تو جماعت اسلامی میں انتخابات میں شرکت کے مسئلے پر اختلاف ہو گیا۔ بعض لوگوں کی رائے تھی کہ دعوت کا کام مکمل ہونے سے پہلے ریاست کے ذریعے غلبۂ دین کی حکمتِ عملی مناسب نہیں۔ مولانا کا جواب تھا کہ دعوت کا کام بہت اہم ہے اسے ہوتا رہنا چاہیے لیکن اس کی تکمیل کے انتظار میں ہم انتخابات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے کیوں کہ یہ تبدیلئ امامت کا وقت ہے یہ ایسا موقع ہے جسے استعمال کرنا ضروری ہے۔ پنجاب کے انتخابات میں جماعت کو شکست ہوئی اور ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کلی شکست ہوئی اور بعد کے حالات بھی کچھ خوش گوار نہیں رہے لیکن ایک عجیب دلیل جو جماعت کے ایک اہم رہنما نے انتخابات کے حق میں دی وہ یہ تھی کہ ہمارے لٹریچر سے جو لوگ متاثر ہو رہے ہیں ان کی بہت بڑی تعداد ہے جن کی تعداد کا علم ہمیں انتخابات کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس ذریعے نے بتایا ہے کہ صورتِ واقعہ وہ نہیں ہے تو کیا جماعت دعوت کے کام کی طرف لوٹے گی یا انتخابی عمل میں ہی شریک رہے گی؟ دعوت کے کام میں بنیادی مسئلہ اعتقادات کا آجاتا ہے۔ دیوبندی، بریلوی مکتب فکر جماعت کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ یہ بدعقیدہ لوگ ہیں لہٰذا دعوت کا کام شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جماعت اسلامی دینی مکاتب فکر کے ساتھ بیٹھ کر تمام مکاتب فکر سے اعتقادی اختلافات کو حل کرے ورنہ دعوت اور انتخابات دونوں کا کام آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ ترکی کے نتائج سے یا اردگان کی کامیابی سے جماعت کو یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ اردگان استنبول کا مئیر بن کر اور احمدی نژاد نے تہران کا مئیر بن کر قومی قیادت کا منصب سنبھال لیا تھا ہم بھی وہی تجربہ کریں گے ایران اور ترکی کے حالات بالکل مختلف ہیں۔

حصولِ اقتدار کے لیے عجلت

* اقتدار کے حصول میں عجلت نے اسلامی تحریکوں کو الجزائر اور مصر میں سخت نقصان پہنچایا۔ اس معاملے میں حزب اللہ کا کردار منفرد ہے جس نے اقتدار کا حصہ بننے سے انکار کر

دیا۔ الجزائر میں اسلامک فرنٹ کو بلدیاتی انتخابات میں ۹۹ فی صد کامیابی ہوئی، فوج نے اقتدار دینے سے انکار کر دیا، اسلامک فرنٹ نے فوج سے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور شدید تکالیف اٹھائیں حالاں کہ بہتر یہی تھا کہ حالات کو ایران کی طرح انقلاب کے حق میں کیا جاتا۔ اقدام کا فیصلہ بہت ہی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے کیوں کہ اس کے بعد پیچھے ہٹنے کا کا راستہ نہیں رہتا۔ مصر کے انتخابات میں اخوان المسلمین کو ۵۱ فیصد ووٹ ملے اور حسنی مبارک کے حامیوں کو ۴۹ فیصد یعنی اخوان کو صرف دو فی صد ووٹ کی برتری حاصل تھی۔ ہم نے اپنے اخوانی دوستوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اقتدار نہ لیں اور کہہ دیں کہ جب تک نوے فی صد لوگ ہم پر اعتماد نہیں کرتے ہم اقتدار نہیں لیں گے۔ سادہ اکثریت مسائل پیدا کرے گی اور اخوان کی سیاسی کامیابی امریکہ سعودی عرب کے لیے ناقابل قبول ہوگی لہٰذا جب تک وہ حالات پیدا نہ ہوں اقتدار سے فاصلہ ہی بہتر ہے لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ اخوان کو دوبارہ شدید آزمائش کا سامنا ہے۔ ہر مسلمان کو ان کے لیے دعا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انھیں مشکلات سے نکالے اور ان کے لیے اصولوں کے مطابق اقتدار کا راستہ ہموار کرے۔

دینی سیاسی جماعتوں کا اخلاقی زوال

ایک اہم بات جس کا دنیا میں ہر جگہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ انتخابی عمل میں شرکت کرنے والی مذہبی، انقلابی، احیائی تحریکیں انتخابی مہم میں اسلامی اقدار، روایات، تہذیب، اخلاقیات کے معاملے میں مسلسل پیچھے ہٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ لبرل سیکولر جماعتوں کی طرز پر اپنی انتخابی مہم چلاتی نظر آتی ہیں جس میں اسلامی اقدار تحلیل ہوتی نظر آتی ہیں انتخابی مہمات کے لیے منعقد کردہ تفریحی پروگراموں میں مخلوط محافل بھی منعقد کی جاتی ہیں۔ انتخابات کا مقصد اگر تبدیلی، انقلاب، اسلام کا غلبہ ہے تو اسلامی اقدار، اخلاقیات انتخابی عمل میں مسلسل کم زور کیوں ہوتی ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ کیا انتخابی جمہوریت کی ماہیت ہی ایسی ہے کہ اس کے سانچے میں مذہبی اقدار پر عمل کرنا محال ہوجاتا ہے؟

دینی سیاسی جماعتیں فوج کی حمایت کیوں حاصل نہیں کرسکیں؟

انتخابی سیاست میں عمران خان نے فوج کے ذریعے انجنیئرڈ انتخابات میں کامیابی

حاصل کی مگراس کامیابی کے بعداس نے عوام میں مقبولیت حاصل کی۔ذوالفقارعلی بھٹواور مجیب الرحمٰن کے بعدعمران خان کوعوام میں بے پناہ سیاسی مقبولیت حاصل ہوئی۔اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن پر بات ہوسکتی ہے لیکن عمران خان کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہیں فوج کے حلقے میں بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ بہت سے سپاہی، افسران دل وجان سے عمران خان پر فدا تھے چھ جرنیل جواب ریٹائر ہو چکے وہ عمران خان کے زبردست مداح تھے جنرل باجوہ کی جانب سے عمران خان کی مخالفت کے باوجود فوج میں عمران خان کی مقبولیت برقرار رہی ۹ مئی کے حادثے کے بعدفوج میں صفائی کاعمل شروع ہواتوعمران خان کے حامی افسران کی برطرفی شروع ہوئی۔ایک لیفٹیننٹ جنرل، دومیجر جنرل کوریٹائرکردیا گیا ٦ بریگیڈیئر بھی ریٹائرکئے گئے مختلف افسران کے بارے میں تحقیقات جاری ہیں۔ہماراسوال یہ ہے کہ عمران خان کوفوج میں جومقبولیت ملی وہ مذہبی سیاسی قیادت کو کیوں حاصل نہ ہوسکی؟ مذہبی سیاسی جماعتوں کی عمراور تجربہ عمران خان سے بہت زیادہ ہے۔عمران خان پہلی مرتبہ ۱۹۹۳ء میں ISI کے سربراہ حمیدگل سے ملے۔حمیدگل کی ریٹائرمنٹ کے بعدعمران خان نے ان کے ساتھ مل کر PTI قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔PTI کے قیام کے لیے عمران خان اورحمیدگل میں ایک تحریری معاہدہ ہواجس کے ضامن جاوید غامدی صاحب تھے اور گواہ محمدعلی درانی اورمحمدمنصور اختر مرحوم(یہ معلومات سلیم صافی نے اپنے کالم میں شائع کی ہیں)۔جنرل حمیدگل کو پارٹی کا چیئرمین اورعمران خان کوصدر بنانے کا فیصلہ ہوا۔حمیدگل بیرونِ ملک دورے پر گئے توعمران خان نےPTI بنانے کااعلان کردیااورحمیدگل کے نام کااعلان نہیں کیا۔اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ عمران خان کواشارہ کردیا گیا تھا کہ حمیدگل کے ساتھ اشتراک قابلِ قبول نہیں ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ عمران خان جن کے امریکہ سے خاص تعلقات ہیں پاکستانی سیاست میں امریکہ کے سب سے بڑے مخالف بن کرابھرے حالانکہ امریکہ کی اصل مخالف پاکستان کی مذہبی سیاسی جماعتیں ہیں اورامریکہ بھی ان مذہبی سیاسی جماعتوں کا دشمن ہے۔اسی لیے مولانا فضل الرحمان کووزیراعظم نہیں بننے دیا گیا۔افسوس یہ ہے کہ مذہبی سیاسی قیادت عمران کے اس جھوٹ کا مقابلہ نہ کرسکی۔سیاسی سطح پرعمران خان کا مقابلہ کیا جاتا تومذہبی سیاست کونئی طاقت میسرآتی۔

حکمتِ عملی کو دین سمجھنے کی غلطی

مذہبی سیاسی جماعتوں کی سب سے بڑی کم زوری یہ ہے کہ وہ حکمت عملی کو اصول کا درجہ دیتی ہیں اور حکمتِ عملی تبدیل کرنے کی قائل نہیں حالانکہ حکمتِ عملی مختلف حالات میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ایک حکمت عملی ناکام ہو جائے تو دوسری حکمتِ عملی تخلیق کی جا سکتی ہے لیکن یہ جماعتیں اپنی حکمتِ عملی کو اٹل، محکم، ناقابل تغیر خیال کرتی ہیں مثلاً ستر سال تک جمہوری جدوجہد میں مسلسل ناکامی کے باوجود یہ دوسری حکمتِ عملی اختیار کرنے پر تیار نہیں۔ یہ جماعتیں اب سنگل ایشو موومنٹ میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔کوئی مسئلہ ہاتھ آ گیا اس پر ایک نکاتی تحریک چلا دی گئی۔ اس تحریک کو جامع بنانے کے بجائے محدود ہی رکھا گیا جس کے نتیجے میں تحریک کی طاقت رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتی ہے اور اس کم زوری سے جمہوری عمل مزید مضبوط ہوتا ہے۔

کیا کسی معاصر عالم کا فہمِ دین حجت ہو سکتا ہے؟

جمہوری جدوجہد کے بجائے کوئی دوسرا طریقہ: جب بھی یہ بات کی جاتی ہے تو مذہبی جماعتوں کو دوسرا راستہ صرف عسکریت پسندی ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان دو طریقوں کے سوا کسی اور طریقے کے بارے میں سوچنے پر تیار نہیں۔ جمہوریت، خروج اور جہاد کے سوا دوسرے کئی راستے ہیں مگر ان میں لگتی ہے محنت زیادہ۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری محنت کا پھل ابھی اور اسی وقت اسی دنیا میں مل جائے۔ ایک مذہبی جماعت نے حکمتِ عملی کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کی حکمتِ عملی ہی دین ہے جس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں لہٰذا یہ جماعت خروج اور جہاد کی سرے سے قائل ہی نہیں۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ جہاد کی تاریخ ہے لیکن جہاد ہو چکا ہے اب جہاد صرف اس وقت ہو گا جب ہم برسرِ اقتدار آئیں گے۔ اس وقت تک جہاد معطل ہے۔حکمتِ عملی کو اصول بنانے کے نتائج کس طرح برآمد ہوتے ہیں یہ اس کی ایک اہم مثال ہے۔صرف اپنے فہم کو دین سمجھنا اور امت کے اجتماعی فہم کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ ان علماء، فقہاء، اسلاف کی آراء ہیں اور ہمارے لیے حجت نہیں یہ ان کا فہم ہے اسلاف کا فہم حجت نہیں مگر ان کا ذاتی فہم حجت ہے۔

کیا انقلاب ہی آخری حل ہے؟

کچھ تحریکوں کا یہ بھی نقطۂ نظر ہے کہ جدید ریاست اور سرمایہ دارانہ نظام شدید ترین جبر و تشدد کے ذریعے کامیاب ہوئے ہیں۔ جدید ریاست کو تشدد پر کامل اجارہ داری (Monopoly of Violence) حاصل ہے لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام اور جدید ریاست کو تشدد کے بغیر شکست نہیں دی جا سکتی۔ سرمایہ دارانہ نظام عسکری انقلاب کے ذریعے غالب ہوا لہٰذا اسے عسکری انقلاب ہی تباہ کر سکتا ہے یا فوج کو ہم خیال بنالیا جائے یا فوج کو ماؤزے تنگ کے عوامی مارچ کی طرح شکست دی جائے۔ ہمارے خیال میں ان راستوں کے علاوہ بھی دوسرے راستے ہیں لیکن یہ بات درست ہے کہ تمام جدید انقلابات خواہ انقلاب ایران ہی کیوں نہ ہو فوج کو شکست دے کر یا فوج کو حامی بنا کر برپا کئے گئے۔

اسلام میں عورت کا کردار کیا ہے؟

مذہبی سیاسی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں کا بہت بڑا مسئلہ اسلام میں عورت کے مقام اور مرتبہ کا ہے۔ شریعت نے اس کا دائرہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا ہے "قرن فی بیوتکن" لیکن اسلامی تحریکیں عورتوں کو بھی سیاسی، عوامی جدوجہد میں شامل کر رہی ہیں۔ مخلوط سیاسی جلسے جلوس اب مسئلہ نہیں ہے کیوں کہ ہمیں اپنی طاقت کا اظہار کرنا ہے۔ روایت کے مکتبۂ فکر کے ڈاکٹر حسین نصر کے بیٹے ڈاکٹر ولی رضا نصر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ میں کبھی عورت اتنی بڑی تعداد میں گھروں سے باہر نکل کر پبلک لائف (عوامی زندگی) کا حصہ نہیں بنی لہٰذا مغرب اس عورت کے لباس، حجاب، نقاب پر اعتراض نہ کرے، انھیں اسی حال میں نکلنے دے۔ دوسرے معنوں میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ جب یہ عورت باہر نکلتی رہے گی تو ایک دن خود اپنا نقاب و حجاب بھی اتار دے گی لہٰذا مغرب حجاب، نقاب کے مسئلے پر حساسیت کا مظاہرہ نہ کرے بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر عورت اتنے بڑے پیمانے پر ملازمت و دیگر کاموں کے لیے گھر سے باہر نکلے گی تو گھر کا کیا ہوگا؟ اسے کون سنبھالے گا پھر؟ Day Care Centre اور Old Homes کی ضرورت بھی پڑے گی۔ کیا اسلام نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ عورت اپنی اصل ذمہ داریاں ادا کرنے کی بجائے بچوں کو اور بوڑھوں کو کسی ادارے کے سپرد کر

دے۔ مصر کی اسلامی جماعت النور پارٹی تو فخر سے کہتی ہے کہ ہمارے ملک میں عورت افرادی قوت Work Force کا حصہ ہے اور یہ حصہ ۲۶ فیصد ہے اور اس میں مزید اضافہ ہوگا۔ کیا اسلامی علمیت، شریعت عورت کو رضا کارانہ طور پر گھروں سے باہر نکالنے کے طریقوں کی اجازت دیتی ہے امت کا تواتر وتعامل عورت کے بارے میں کیا رہا ہے؟ کیا اسلامی تحریکیں اس سوال کو نظر انداز کرسکتی ہیں؟

پاکستان کی ایک بہت بڑی سیاسی اسلامی جماعت سے وابستہ اہم اصحاب کے ادارے (تھنک ٹینک) میں ملازمت میں عورتوں کو مردوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور اس کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ کیا اسلامی علمیت کے دائرے میں یہ قابلِ تعریف عمل ہے؟ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے دعوے اپنی جگہ لیکن عورت کو مسلسل اور مستقل پبلک لائف میں سمونے کے عمل سے خاندانی نظام تباہ ہوگا یا نہیں؟ یہ ہے اہم سوال۔ اس سوال پر بار بار غور کرنے کی ضرورت ہے۔

معاشرتی مسائل سے عدم اعتناء

پاکستانی معاشرے پر جدیدیت اور مغربیت کے اثرات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں روایتی، تاریخی، خاندانی، نسلی، لسانی، مذہبی، قبائلی اجتماعتیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں لہٰذا معاشرتی مسائل میں ایک دم بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ مذہبی سیاست ان مسائل پر توجہ نہیں کرتی حالانکہ یہ ایک اہم دائرہ ہے لوگوں کے معاشرتی مسائل کے حل کے لیے کوئی ادارہ کام نہیں کر رہا۔ سیاسی عمل میں لوگ پانچ سال میں ایک مرتبہ حصہ لیتے ہیں لیکن معاشرتی معاملات ان کی زندگی کے نوے فی صد حصّے پر محیط ہوتے ہیں۔ اسلامی جماعتیں معاشرتی مسائل کے حل کے لیے بھرپور توجہ دے کر لوگوں کی اصلاح بھی کرسکتی ہیں اور انھیں اپنا ہم خیال بھی بناسکتی ہیں۔

میڈیا کی پیدا کردہ تباہی

معاشرتی تباہی وبربادی کا ایک اہم ذریعہ TV بھی تھا اب زمانہ TV کے زمانے سے بہت آگے چلا گیا۔ TV سے زیادہ خطرناک ذرائع ابلاغ چوبیس گھنٹے آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ دعوتِ اسلامی، جماعۃ الدعوۃ اور جماعت اسلامی نے ایک دور میں TV کے خلاف ہمہ گیر

تحریکیں چلائیں، دعوتِ اسلامی نے اپنے ارکان سے کہا کہ TV کو گھر سے نکال دو۔ ہزاروں لوگوں نے TV نکال کر پھینک دیئے۔ جماعت اسلامی نے کہا TV کو سنگسار کر دو لہٰذا بہت سے شہروں میں جماعت کے ہزاروں کارکنوں نے TV کو سنگسار کر دیا۔لیکن انھوں نے اس نظام کو سنگسار نہیں کیا جہاں سے TV برآمد ہو رہا تھا یعنی ماڈرن ازم۔ ماڈرن ازم اور اس سے ملحق ماڈرن سائنس وٹیکنالوجی کے مظاہر جیسے مباحث کا ہم نے علمی احاطہ نہیں کیا، صرف جذبات سے کام لیا۔ جذبات سے کام لینا کوئی بری بات نہیں مگر اس کام کو دوام ملنا چاہیے۔ TV تو اس نظام کی عطا، پیداوار، آخری جز و اور پروڈکٹ ہے اسے تباہ کرنے سے نظام تباہ نہیں ہوگا۔ نظام کو تباہ کرنے کے لیے پہلے اسے سمجھنا اور پھر حکمت عملی طے کرنا ہوگا لیکن ہماری جماعتیں یہ کام نہیں کر سکیں۔ بلکہ ان جماعتوں نے اپنے اپنے TV چینل بنا لیے۔ چینل بنانے کے بعد ان جماعتوں میں میڈیا سے متعلق کیا تبدیلی آئی، اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ جو لوگ میڈیا کے ذریعے دلوں کی دنیا بدلنے گئے تھے وہ خود ہی بدل گئے۔ ان کے رنگ روغن، رنگین لباس، رنگوں کے تناسب میک اپ کو دیکھا جائے تو انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ہمیں بدلنے والے خود کیوں بدل گئے۔ میڈیا ریاکاری کا منظم شیطانی نظام ہے اسی لیے ساری توجہ Rating پر ہوتی ہے ایک نیک عالم دین اپنے چینل کے لیے گڑگڑاتا ہے Share کریں، Forward کریں، Like کریں، Subscribe کریں ردعمل دیں۔ کیا تاریخِ اسلام میں کسی عالم دین نے اس قسم کی غیر اخلاقی حرکات کی ہیں؟ اسلاف کے ماننے والے اسلاف کے راستے سے ہٹ گئے۔ یہ ہے میڈیا کی قوت۔

ریاست کے اندر ریاست کا قیام ممکن ہے

لڑکیوں، عورتوں، خاندان کو بے شمار معاشرتی مسائل کا سامنا ہے۔ ماڈرن ازم خاندان کو توڑ رہا ہے مگر اس کو جوڑنے والی قوتیں موجود نہیں ہیں۔ مساجد، مدارس، خانقاہ، اسلامی تحریکیں، مذہبی سیاسی جماعتیں معاشرت کی اصلاح، ترتیب کو بنیادی مسئلہ بنا دیں خاندان کی ٹوٹ پھوٹ سے پولیس، عدالت تک معاملات پہنچ رہے ہیں۔ مساجد کی سطح پر روایتی نظام قضاء کو بحال کیا جائے جہاں تمام مسائل ابتدائی مرحلے میں ہی حل ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو

ریاستی اداروں تک پہنچنے سے پہلے قابو کیا جائے اور مدارس مساجد کی اصلاحی کمیٹیاں اس طرح کے مسائل کو خود حل کرا دیں۔ ان کوششوں سے ریاست کے اندر ایک پر امن ریاست قائم کی جاسکتی ہے۔ اس ریاست کا دائرہ کار اور دائرہ اثر مسلسل بڑھ سکتا ہے۔ لوگ ریاست اور ریاستی اداروں پر اعتماد نہیں کرتے لہٰذا یہ میدان خالی ہے جسے علماء، اسلامی تحریکیں، مساجد اور مدارس سنبھال سکتے ہیں۔ یہ بہت اہم میدان ہے جس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں خلافتِ اسلامیہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد امارتِ شرعیہ بہار کا تجربہ کامیاب رہا۔ تمام دینی مکاتب فکر امارت پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ اس کا فتویٰ حرفِ آخر ہوتا تھا۔ اس تجربے کو وسعت دے کر متبادل ریاست قائم کی جاسکتی ہے۔

خانقاہوں کے ذریعے نفسیاتی علاج

ماڈرن ازم، ماڈرن ریاست اور ماڈرنائزیشن نے معاشرے میں نفسیاتی مریضوں کی تعداد میں بہت اضافہ کیا ہے۔ جو معاشرے سب سے زیادہ ماڈرن ہیں ان معاشروں میں سب سے زیادہ نفسیاتی مریض، قاتل، دہشت گرد، مجرم، قیدی نظر آتے ہیں۔ پاکستان ابھی ماڈرن ازم میں پوری طرح نہیں رنگا جاسکا لہٰذا یہاں مریضوں کی تعداد مغرب کے مقابلے میں کم ہے۔ ان نفسیاتی مریضوں کے روحانی علاج کی ضرورت ہے کیوں کہ جدیدیت کے مظاہر اور محرومیوں نے فرد کو مریض بنا دیا ہے۔ خانقاہ کا ادارہ ان مریضوں کا بہترین علاج کرسکتا ہے۔ صوفیاء کے حلقے ان نفسیاتی مریضوں کا بہترین علاج کر سکتے ہیں لہٰذا ان مریضوں پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے جن کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی ہے۔ دعوتِ اسلامی، تبلیغی جماعت جیسے ادارے ان مریضوں پر خصوصی توجہ کر کے ان کے نفسیاتی مسائل کے حل میں مرکزی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اِن امراض کی بنیادی وجہ ہے حبّ دنیا یعنی معیار زندگی میں اضافے کی خواہش (Quality Of Life)۔ اور اسبابِ دنیا کے کم ہونے کی شکایت۔ تمام نفسیاتی امراض یہیں سے پھوٹ رہے ہیں۔ آزادی کا عقیدہ ان امراض کی جڑ ہے۔ علماء کرام اس موضوع پر محنت کریں تو وہ نوجوان لڑکوں لڑکیوں کو اسلامی روحانیت کے دائرے میں سمو سکتے ہیں۔ اسلام نے معیارِ زندگی کے فتنے کا خاتمہ کرنے کے لیے قرض اور سود سے منع کیا۔ ہلکی

کھجوروں کے عوض اعلیٰ کھجوریں خریدنے کی ممانعت کا حکم دیا پہلے ہلکی کھجوریں فروخت کرو پھر ان کی آمدنی سے اعلیٰ کھجوریں خریدو۔

حُبّ دنیا سے بچنا

دنیا کی کسی تہذیب اور مذہب میں معیارِ زندگی بلند کرنے، بحال رکھنے، ایجاد کرنے عام کرنے، لوگوں کو معیارات کی طرف دعوت دینے کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ لوگ عموماً معیار زندگی دو چیزوں سے بڑھاتے ہیں سود پر قرضہ یا غیر سودی قرضہ۔ اللہ کے رسول نے سود اور قرضے کی مذمت میں جو کچھ کہا وہ حدیث میں محفوظ ہے۔ مقروض کی نماز جنازہ پڑھانے سے آپ انکار کردیتے تھے، یہ قرضہ لینے کا ثمر تھا۔ سود تو حرام تھا تو معیار زندگی کا فتنہ کیسے بڑھتا؟ اسلام نے معیارِ زندگی کو بلند کرنے سے روکنے کے لیے جو اصول طے کیا وہ فرمان رسالت تھا کہ سستی کھجوروں کا تبادلہ مہنگی کھجوروں سے نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آپ کو سستی کھجور کے تبادلے میں مہنگی کھجور حاصل کرنا ہے تو پہلے آپ اپنی سستی کھجور بیچ دیں جو رقم حاصل ہو اس سے مہنگی کھجور خریدیں۔ اس حکمت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو معیار زندگی کے فتنے کی اہمیت، وقعت، حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہو۔ مدینۃ النبی کے جس گھر میں شادی ہوتی وہاں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی کا جوڑا مستعار مانگ کر پہنا جاتا۔ یہ تھا صحابہ کا معیارِ زندگی۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گواہی ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے تھے۔ بیت المال سے ستر ہزار درہم کا ہدیہ آیا۔ آپ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ خود پھٹا ہوا لباس پہنا تھا لیکن ستر ہزار درہم اسی وقت خیرات کردیئے، ایک درہم بھی اپنے لیے نہیں رکھا۔

دینی سیاسی جماعتیں انصاف مہیا کریں

اسلامی سیاسی مذہبی جماعتوں نے کبھی متبادل قوت طاقت بننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ان کے اندر ریاست کے اندر ریاست بنانے کے دو عظیم ماڈل تھے ایک بھارت میں امارت شرعیہ بہار کا ماڈل اور دوسرا پاکستان کے صوبہ سرحد میں مفتی عبدالرحیم پوپلزئی صاحب کا قائم کردہ ماڈل کہ پورا پاکستان رویت ہلال کمیٹی کے فیصلے پر عید مناتا ہے لیکن صوبہ سرحد کی حکومت مفتی صاحب کے حکم پر عید مناتی ہے۔ مفتی صاحب نے عوام میں، معاشرے میں کس

طرح اپنی اخلاقی معاشرتی روحانی قوت کو مجتمع کیا؟ ریاست کے اندر کیسے ریاست تعمیر کی؟ یہ دونوں مثالیں بہت اہم ہیں۔ امارت شرعیہ بہار کے ماڈل کو تو فوری طور پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ پاکستانی ڈسٹرکٹ کورٹس، ہائی کورٹس سپریم کورٹس میں انصاف لاکھوں روپے میں وکیلوں کے ذریعے سالوں میں ملتا ہے یا یہ پورا نظام انصاف مقامی پودا نہیں یہ برطانیہ کا نظام ہے اورصرف Individual کے فیصلے کرسکتا ہے یہ کسی اجتماعیت، قبیلے، برادری کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ ایک ناکارہ، بے کار، مہنگا، مغربی خود کاشتہ پودا ہے۔ حیرت ہے کہ ہم اسے اسلام کے پانی سے سینچ رہے ہیں۔ رائج عدالتی نظام روایتی معاشروں اور مذہبی تہذیبوں کے لے قاتل ہے۔

علماء ثالثی کمیٹیاں قائم کریں

علماء کو جلد از جلد نظام قضا قائم کرنا چاہیے۔ معاشرتی مضبوطی مخلصانہ تعلقات اور صلہ رحمی کے لیے ضروری ہے مثلاً محلے کے دو پڑوسیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ مسئلہ محلے میں حل ہو جاتا لیکن غصے میں ایک پڑوسی پولیس، تھانے، وکیل کے پاس چلے گئے۔ کتے نے پڑوسی کو کاٹ لیا تھا۔ کتا کے مالک گرفتار ہوئے، ضمانت ہوئی، پڑوسی نے زخمی کا علاج کرایا۔ سوال یہ ہے کہ اس کاروائی کے بعد کیا یہ دونوں پڑوسی زندگی میں کبھی ایک دوسرے کے دوست بن سکیں گے؟ ظاہر ہے کبھی نہیں۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گے یہی مسئلہ محلے میں، مسجد کی سطح پر، قاضی کی سطح پر اصلاحی کمیٹی کے ذریعے حل ہوتا تو دونوں پڑوسی دوست بنتے، ان کی غلطی کا ازالہ ہوتا، مسئلہ ختم ہو جاتا، محبتیں قائم ہو جاتیں۔ جدید قانونی نظام لوگوں کے معاشرتی روابط، تعلقات، محبت، مودت، رشتوں سب کو تباہ و برباد کرتا ہے اور بڑی بے شرمی سے کہتا ہے کہ یہ ہے Rule of Law۔

عورت کو عوامی زندگی میں نہ لائیں

اسلامی تحریکیں سیاسی، سماجی، عوامی سرگرمیوں میں عورت کی شمولیت سے گریز کریں۔ بڑی بڑی مذہبی سیاسی جماعتیں عورت کے معاملے میں مسلسل تغیر پذیر ہو رہی ہیں۔ یہ مغرب کی کامیابی ہے۔ مغرب پکارتا ہے تمہاری تہذیب اور زندگی میں عورت کیوں نظر نہیں آرہی؟ تو

ہم جواباً یہ کہتے ہیں کہ دیکھو ہماری عورت کہاں کہاں موجود ہے۔ اسلام کا نظامِ حیا وعفت مخلوط اجتماعات کے لیے ازلی اور ابدی خطرہ ہے۔ نصوص نے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے، ازواجِ مطہرات نے جس طرح پردہ پر عمل کر کے دکھایا اس میں اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ یہ اجتہاد صرف فساد کا دروازے کھولے گا۔ اسے اجتہاد بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اجتہاد قرآن وسنت اور اجماع وقیاس کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ قرآن وسنت سے انحراف کر کے اجتہاد کیا جائے۔ آج کل انتخابی مہمات کو کامیاب بنانے کے لیے بہت سی جماعتیں اس طرزِ عمل کو اختیار کر رہی ہیں۔ یہ ہماری کامیابی نہیں ناکامی اور پسپائی ہے۔

دینی جماعتوں میں تعاون کی فضا ہونی چاہیے

مذہبی جماعتوں، مذہبی سیاسی جماعتوں، اسلامی تحریکوں، جہادی احیائی انقلابی جماعتوں، تصوف کے حلقوں ان سب کے کاموں میں تطبیق کی ضرورت ہے نہ کہ اصولِ تفریق کی۔ یہ سب ایک دوسرے کے فطری حلیف ہیں، اگر ان کے درمیان اعتقادی مسائل طے ہو جائیں۔ مغربی علوم کی طرح ہمارے علومِ دینیہ ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے بلکہ ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں۔ قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، کلام یہ سب ایک دوسرے کے دست وبازو ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ بنیانِ مرصوص ہیں علم کی ہر شاخ دوسری شاخ کی تائید، توثیق کرتی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تمام علوم ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ان کا آپس کا تعلق مخاصمانہ ہے۔ مغربی یونیورسٹی میں انوائرمنٹل سائنس کے شعبے بتا رہے ہیں کہ جدید سائنس کتنی تباہ کن، خطرناک، مہلک ہے اور دنیا کو تباہ کر سکتی ہے۔ اصولاً ماحولیاتی سائنس کی ایجاد کے بعد جدید سائنس کے تمام شعبے بند کر دیئے جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مغرب کے علوم میں مخاصمانہ تعلق ہے جبکہ اسلامی علوم میں مفاہمانہ تعلق ہے۔ اسی طرح مختلف جماعتوں نے دین کے مختلف شعبوں کو اپنے لیے اختیار کیا ہے۔ کوئی دعوت کا کام کر رہا ہے، کوئی جہاد کا، کوئی فتویٰ کا، کوئی بچوں کو نورانی قاعدہ پڑھا رہا ہے، کوئی اجتہاد کر رہا ہے، کوئی تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، تعلیم وتدریس کر رہا ہے، یہ سارے دین ہی کے کام ہیں۔ کسی کام کو کمتر نہ سمجھا جائے اور دین کے لیے کام کرنے والے کسی فرد اور کسی جماعت کو حقیر نہ سمجھا جائے، ایک

دوسرے کی اصلاح کی اور ایک دوسرے سے تعاون کی کوشش کی جائے۔

امریکہ کو دینی جماعتیں پسند نہیں

ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ مذہبی، دینی، سیاسی جماعتیں ریاست پاکستان کے بارے میں جو بھی نقطۂ نظر رکھتی ہیں اس پر انھیں حیرت کیوں نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک دعویٰ یہ ہے کہ پاکستان علماء نے بنایا۔ تو سوال یہ ہے کہ پاکستان کی کابینہ میں کسی مولانا کو وزیر بنایا گیا؟ کیا قاضی عدالت قائم ہوئی؟ ملک کا قومی ترانہ بنا تو ترانہ میں حرام موسیقی کو شامل کیا گیا۔ یہ سب کچھ کون کر رہا تھا؟ علماء کیوں خاموش تھے؟ مگر کیوں وہ امیر المومنین جناح صاحب سے یہ مطالبہ نہ منوا سکے کہ حرام موسیقی ترانے سے نکال دو، ہم اسے کسی حالت میں تسلیم نہیں کریں گے۔ حیرت تو یہ ہے کہ علماء نے اپنے ہی دیئے گئے فتوے دارالاسلام کے خلاف لیاقت نہرو پیکٹ قبول کیا جس کے بعد دارالاسلام اور دارالکفر کا فرق ہی ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔ اب پاکستان ہندوستان دونوں آزاد قومی ریاستیں تھیں، ان کے شہری اپنے ملک کے شہری تھے اور پاکستان نہیں آ سکتے تھے۔ لیاقت نہرو پیکٹ کے بعد تحریک پاکستان کا یہ دعویٰ بھی حکومت پاکستان نے رد کر دیا کہ پاکستان دارالاسلام ہے اور ہندوستان دارالحرب۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد امریکی سفیر نے صدر امریکہ کو پاکستان کے علماء کے بارے میں خط لکھا کہ ملا غیر تعلیم یافتہ (Uneducated) ہیں جو مغرب کی حلیف پاکستانی ریاست کے خلاف ہیں اور پاکستان کو دورِ ظلمات میں لے جانا چاہتے ہیں۔ امریکی سفیر پاکستانی ریاست اور علماء کو حلیف کے طور پر نہیں حریف کے طور پر دیکھ رہا ہے، ملا کو جاہل قرار دے رہا ہے، ریاست کو مغرب پرست کی دستار عطا کر رہا ہے اور ہم ابھی تک کچھ سوچنے سمجھنے پر ہی تیار نہیں۔ مولوی، ملّا، مدرسہ، مسجد، دینی تحریک، جہادی تنظیم، خانقاہ، اسلام، ہر شے سے مغرب کو نفرت ہے اور پاکستانی ریاست بھی اس کام میں پیچھے نہیں۔ امریکی سفیر نے اپنے خط میں (دستاویز 62 ص 64) دو خطروں کی نشان دہی کی مولوی کا اسلام اور کمیونزم۔ یہ دونوں پاکستان کے لیے خطرہ تھے علماء کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

Uneducated religious leaders (mullahs) who oppose the

present Western minded government & a return to primitive Islamic principles.[K.Arif, Pak America Relations, Vol 1, page 64, Document 62]

امریکی سفیر نے جو کچھ ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا ریاست پاکستان مولوی کو آج بھی ایسا ہی سمجھتی ہے کہ یہ مولوی جاہل ہیں۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ریاست پاکستان دینی مدارس کی تعلیم کو Brain Washing کہتی ہے اور اسکول کالج یونیورسٹی کی تعلیم کو Education کہتی ہے۔ جنرل باجوہ نے کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا دینی مدارس یا تو مولوی پیدا کرتے ہیں یا دہشت گرد۔ GHQ میں جنرل باجوہ کے کہنے پر دینی مدارس کے ان طلباء کو بلایا گیا جنھوں نے اسکول کالج کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کی کیوں کے یہ طلباء برین واشنگ کے دریا سے نکل کر قومی دھارے کا حصہ بن گئے تھے۔سوال یہ ہے کہ باجوہ صاحب نے دینی مدارس کے امتحانات میں پوزیشن لینے والے طلباء وطالبات کو GHQ آنے کی دعوت کیوں نہیں دی؟ جواب باجوہ صاحب خود دے چکے ہیں کہ مدرسے مولوی یا دہشت گرد پیدا کرتے ہیں لہٰذا ان مولویوں کو کیسے مدعو کیا جاسکتا ہے؟ کیا دینی جماعتیں کبھی ان امور پر غور فرمائیں گی؟ جماعت اسلامی نے Educated مسلمان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے نظامِ تربیت سے جو حامی، رفیق، رکن، کارکن نکلتا ہے وہ دنیا کو بھی جانتا ہے اور مولوی سے بہتر جانتا ہے اور دین کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ہم مولوی پیدا نہیں کرتے، پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان پیدا کرتے ہیں جو حمیت دینی اور غیرت دینی میں مولوی سے کم تر نہیں لیکن ریاست پاکستان نے جماعت اسلامی جیسی Educated جماعت کو بھی جو (Mullahs) نہیں تھی اسے بھی قبول نہیں کیا۔ ریاست نے PPP, PML, NAP, MQM, PTI, کو قبول کیا انھیں اقتدار دیا مگر جماعت کو اقتدار کے قابل نہ سمجھا۔ جدید ریاست میں اسلام کی بات کرنے والا Uneducated ہی کہلاتا ہے۔ ریاست کو مولوی ہی نہیں مفکر اسلام، مدبر اسلام بھی پسند نہیں ہیں۔

مسجد کو مرکز بنا کر کئی کام کیے جاسکتے ہیں

علماء نے اور دینی جماعتوں نے خود کو مدرسہ، مسجد، خانقاہ، دفاتر تک محدود کر لیا ہے۔

Mass Mobilization کا تصور بالکل دھندلا گیا ہے۔ یہ تحفظِ دین کی حکمتِ عملی ہے جس کی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ علماء ریاست سے مسابقت، مقابلے، کے بغیر بھی اپنی طاقت، قوت، علمیت کے متبادل دائرے بنا سکتے ہیں۔ وہ ہر مسجد کو ایک مرکز میں بدل سکتے ہیں اور مسجد کے اردگرد واقع علاقے کو اسلامی حمیت کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں لیکن آج کل کچھ علماء اپنے مقتدیوں، محلے والوں، پڑوسیوں کو بدلنے کے بجائے یوٹیوب چینل سے دنیا کو بدلنے کے لیے نکل پڑے ہیں حالانکہ ان سے قیامت کے دن یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنے نمازیوں، محلے والوں اور پڑوسیوں کو بدلنے کی کتنی کوشش کی؟ تم انھیں چھوڑ کر پوری دنیا کو مسلمان کرنے کے مشن پر نکلے ہوئے تھے۔ وہ تمھاری ثانوی ذمہ داری تھی پہلی ذمہ داری تو تمہارے علاقے کے لوگ تھے۔ مسجد کو مرکز بنا کر اصلاحی مجالس، پنچایتی کونسل قائم کی جا سکتی ہے۔ تھانے، عدالت، ریاست کے اداروں کے پاس جانے کی بجائے عوام کے مسائل، تنازعات، اختلافات کا حل یہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ سپریم کورٹ نے پانچ سال پہلے غالباً ۹۳۵ معاملات کی فہرست جاری کی تھی اور ریاست کو حکم دیا تھا کہ اس طرح کے مقدمات عدالت کی بجائے پنچایت کی سطح پر حل کیے جائیں۔ پنچایت، جرگہ کا نظام ہر جگہ موجود ہے اسے مضبوط کیا جائے، اس کی اصلاح کی جائے، اس میں علماء اور مفتی حضرات کو شامل کیا جائے تاکہ عوام پر ریاست کے اثر و نفوذ کو کم سے کم کیا جا سکے۔ اس نظام سے انصاف بھی جلد از جلد حاصل ہوگا اور بلا معاوضہ حاصل ہوگا اور یہ نظام لوگوں کے معاشرتی تعلقات کی بہتری کا بہترین سبب بنے گا۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں۔ محلے میں پڑوسی کے کتے نے پڑوسی کے بچے کو کاٹ لیا۔ پڑوسی نے تھانے میں رپورٹ لکھوا دی۔ پڑوسی گرفتار ہو گیا۔ عدالت سے ضمانت پر رہائی ہو گئی۔ کیا اس عدالتی کارروائی کے بعد یہ دونوں پڑوسی اپنے تعلقات اچھے رکھ سکیں گے؟ اس کے برعکس اس معاملے میں مسجد کمیٹی، محلہ کمیٹی، اصلاحی کمیٹی، پنچایت شامل ہو جاتی۔ دونوں پڑوسیوں کو بٹھا کر صلح کروا دیتی تو کیا دونوں پڑوسیوں کے پرانے تعلقات بحال نہ ہو جاتے؟ عدالت، پولیس، ریاست کو جس معاملے میں داخل کیا جائے گا اس کے نتیجے میں معاشرتی تعلقات کا خاتمہ ہوگا اور آپس کی دشمنی بڑھتی جائے گی کیا ہماری دینی جماعتوں نے ان مسائل پر غور و فکر کو ترجیح دی ہے؟

علماء کو قومی دھارے میں شامل کرنا

ہر متشدد، عسکری، مزاحمتی، مذہبی، ایک نکاتی تحریک سے ریاست کا صرف ایک ہی مطالبہ ہوتا ہے کہ آپ قومی دھارے میں شامل ہو جائیں۔ قومی دھارے میں شامل ہونے کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ سیاسی جماعت بنیں اور سیاسی عمل میں شریک ہو جائیں کیوں کہ ریاست کو معلوم ہے کہ جب تک یہ سیاسی عمل سے باہر رہیں گے ایک ناقابلِ تسخیر قوت رہیں گے جیسے ہی یہ سیاسی دھارے میں شامل ہوں گے ان کا انقلاب، جوش و ولولہ، مزاحمت، عسکریت، مطالبات، قوت، طاقت خود بخود ختم ہوتی چلی جائے گی۔ یہ بس مطالبات کی سیاست اور حقوق کی سیاست کرتے رہیں گے اور کبھی سیاسی کامیابی حاصل نہ کر سکیں گے جماعت الدعوہ کو ریاست نے یہی مشورہ دیا کہ وہ سیاسی جماعت بن جائے حالانکہ جماعت الدعوہ بھی ریاست کی سرپرستی میں ہی کام کر رہی تھی۔ انہوں نے ملی مسلم لیگ کے نام سے سیاسی جماعت بنالی اور قصور کے ضمنی انتخابات میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اسی الیکشن میں تحریک لبیک پاکستان نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ پہلی پوزیشن مسلم لیگ کی تھی۔ TLP کے سعد رضوی نے حکومت کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فرانسیسی سفیر کو باہر نکالے ورنہ کفن پوش دستے نکلیں گے۔ پنجاب پولیس نے رمضان کے مہینے میں TLP کے پچاس کارکنان شہید کیے۔ اخبارات میں میڈیا میں کوئی خبر نہیں آئی۔ حالات نازک سے نازک تر ہوتے گئے، وسطی پنجاب تک لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھے تو اچانک جنرل باجوہ برآمد ہوئے، وزیر اعظم کو گھاس تک نہیں۔ ڈالی گئی مفتی منیب الرحمان کو TLP سے معاملات طے کرنے کے لیے۔ ایک سرمایہ دار عقیل کریم ڈھیڈی کے گھر پر بلوایا گیا طے یہ ہوا کہ جو معاہدہ ہوا ہے وہ کسی کو نہیں دکھایا جائے گا، نہ پڑھایا جائے گا، اس کے ضامن جنرل باجوہ ہوں گے۔ معاہدہ کیا ہوا کچھ پتہ نہیں چلا کیوں کہ پاکستانی سیاست فوج کے سپرد ہے، وہ فیصلے کرتے ہیں اور مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس معاہدے کے نتیجے میں TLP کی مزاحمتی تحریک جو وسطی پنجاب تک پہنچ چکی تھی ختم ہوگئی، فرانس کے سفیر کو ملک سے نکالنے کا مطالبہ کیا ہوا؟ اس کا پتہ نہ چلا.... TLP سے کہہ دیا گیا کہ آپ سیاسی دھارے کا حصہ بنیں، سیاسی جماعت بنیں پرامن احتجاجی تحریک چلائیں اور کوئی ایسا مطالبہ نہ کریں جس

سے ریاست پاکستان کو عالمی، مالی، معاشی، سیاسی دباؤ کا سامنا کرنا پڑے۔ ہر تحریک کا علاج ریاست کے پاس ایک ہی ہے کہ آپ سیاسی جماعت بن جائیں، ساری زندگی پر امن احتجاج کرتے رہیں، پر تشدد احتجاج برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اگر عوام آپ کو منتخب کر لیں تو آپ اقتدار میں آ جائیں۔ مذہبی سیاست کی سیاسی قوت کا حال یہ ہے کہ ان مذہبی جماعتوں کے پاس دو چار دس بارہ سیٹوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے مگر اس کے باوجود ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے وجود سے دینی مدارس محفوظ ہیں، ان کا نصاب تبدیل نہیں کیا جا رہا۔ ہم نہ ہوتے تو مدرسے ریاست کے قبضے میں ہوتے۔ ان بے چاروں کو یہ تک معلوم نہیں کہ پاکستان جیسی کم زور ریاست نہ دینی مدارس پر قبضہ کر سکتی ہے نہ ان مدارس کو سرکاری امداد سے چلا سکتی ہے۔ بھٹو صاحب کے زمانے میں جو مدارس، مزارات، مساجد اوقاف نے اپنے قبضے میں لیے تھے ان کے حالات سب پر واضح ہیں۔ پاکستانی ریاست کی حالت یہ ہے کہ وہ سڑکیں نہیں بنا سکتی سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشیں نہیں اٹھا سکتی یہ کام ایدھی، چھیپا، NGO، الخدمت کر سکتے ہیں یعنی ایک ناکام، بے لگام، بے ہنگام، بے کار ریاست کی کمزوریاں دور کرنے اور خدمت خلق کرنے کے لیے یہ ادارے آ جاتے ہیں اسی لیے ستار ایدھی کی موت پر پاکستانی فوج کے سربراہ، صدر، وزیر اعظم، چیف جسٹس سب خراجِ تحسین پیش کرنے آئے تھے کہ جو کام ریاست نہ کر سکی وہ عبدالستار ایدھی کر رہا ہے اگر عبدالستار ایدھی ریاست کی مدد نہ کرے تو ریاست میں انقلاب برپا ہو جائے۔ تمام NGO's خواہ وہ جماعت الدعوہ کی ہوں یا جماعتِ اسلامی کی، وہ نادانستہ طور پر خود ہی انقلاب کی راہ روک رہی ہوتی ہیں۔ ریاست کے ذمے تمام کام وہ خود کر کے لوگوں کے دلوں سے ریاست کی نفرت نکال دیتی ہیں۔ پاکستان پہلے دن سے اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے کئی ملکوں سے امداد لیتا رہا ہے۔ اس کا محل وقوع ہی اس کی آمدنی کا اصل ذریعہ ہے۔ دینی مدارس مساجد پر سعودی عرب کی طرح ریاستی کنٹرول ناممکن ہے۔ جناب غامدی صاحب تو بار بار ریاست سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ مساجد پر قبضہ کر لو لیکن سوال یہ ہے کہ لاکھوں مساجد کے لیے اربوں روپے کی تنخواہ کون دے گا اور سرکاری مولوی کہاں سے آئیں گے؟ جاوید غامدی کے مرید تو مساجد میں امامت کو بہت زیادہ اہم کام نہیں سمجھتے تو مولوی ریاست کہاں سے لائے گی؟ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

جدید مولویوں کو تیار کرنے کے لیے بنائی گئی تھی مگر وہاں کا فارغ التحصیل کوئی طالب علم کسی مسجد مدرسہ میں خدمت کرنے پر تیار نہیں۔ وہ دنیا دار مولوی ہیں۔ ان کا مسجد مدرسہ سے کیا تعلق؟ ہمیں آج تک اس یونیورسٹی کا کوئی طالب علم مسجد، مدرسے میں خدمات انجام دیتے ہوئے نہیں مل سکا۔

دینی علم ریاست کی نظر میں علم ہی نہیں

علمائے کرام، دینی جماعتوں، تحریکوں اور دینی سیاسی جماعتوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جدید ریاست، اور پاکستان کی جدید ریاست دینی علم کو علم کیوں نہیں سمجھتی اور دینی علم کی سرپرستی کیوں نہیں کرتی؟ وہ بار بار دینی علم کو Brain Washing کیوں کہتی ہے۔ وہ بار بار دینی اداروں کی اصلاح کے لیے کوشاں کیوں رہتی ہے؟ ریاست کی خواہش ہے کہ تمام دینی مدارس خود کو کالج، یونیورسٹی میں تبدیل کر لیں، دینی مدرسے ختم کر دیں۔ حال ہی میں کراچی کے ایک بہت بڑے مدرسے نے یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کیا اور درس نظامی کو اسلامک اسٹڈیز فیکلٹی میں منتقل کر دیا۔ درس نظامی اب جدید یونیورسٹی کے ایک شعبۂ دینی کے طور پر کام کرے گا۔ ظاہر ہے یہاں وہ تقدس تو موجود نہ ہوگا جو مدرسہ کی عمارت میں ہوتا ہے درس نظامی میں فیس دے کر ہر ایک داخلہ لے سکے گا۔ کچھ عرصہ بعد لڑکیوں کے داخلے بھی شروع ہو جائیں گے۔ مدرسہ کی ساخت کا کلی خاتمہ ہو جائے گا۔ کانٹ کا کارنامہ ہے کہ اس نے عقلیت (Rationalism) اور تجربیت (Empiricism) کو ملا کر یہ تصور دیا کہ علم عقلی اور تجربی ہوتا ہے اور ریاضی کی زبان میں بیان ہوتا ہے۔ جو علم عقل اور تجربے کے معیار پر نہ اترے وہ علم دائرہ علم سے باہر ہے۔ وہ جہالت ہے، گمراہی ہے۔ اس علم کا تعلق سرمایہ سے بھی قائم ہوا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بغیر سائنسی علم کام ہی نہیں کر سکتا لہٰذا ریاست کی تمام سرپرستی سائنسی علوم کو حاصل ہوئی اور اسے ہر ریاست نے بشمول پاکستانی ریاست علم کا درجہ دیا۔ لہٰذا اس علم پر ریاست اربوں روپے خرچ بھی کرتی ہے۔ سائنسی علم خریدا بھی جا سکتا ہے—Import/ Export بھی ہو سکتا ہے۔ اس علم کی Use Value ہی نہیں Exchange Value بھی ہوتی ہے۔ اس علم سے GDP, GNP, GNI, HDI میں اضافہ بھی ہوتا ہے اس علم سے نوکری اور طاقت اور سرمایہ ملتا ہے یہ علم سرپلس Money, Wealth, Capital, پیدا کرتا

ہے۔اس کے برعکس مذہبی علم کی Exchange Value نہیں یہ علم Export Import/ نہیں ہوسکتا نہ اس سے آمدنی ہوتی ہے نہ مذہبی علم کا GDP,GNP,GNI,HDI میں کوئی حصہ، نہ یہ علم زرمبادلہ Foreign Exchange کما سکتا ہے۔لہٰذا اس علم کی سرپرستی ریاست کیوں کرے اتنی سی بات ہماری دینی جماعتوں کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے! یہ افسوس کا مقام ہے۔ہمیں یقین ہے کہ دینی جماعتیں ان موضوعات پر مکالمہ کریں گی اور مسائل کے حل کے لیے مثبت لائحہ عمل طے کریں گی۔

جہادی تنظیموں کی ضرورت نہیں

دینی،فکری،احیائی،انقلابی،جہادی،مزاحمتی،تبلیغی، جماعتوں اور ردعمل کی تحریکوں کے کام میں تطبیق کے ساتھ ساتھ اپنے کام کے مسلسل و مستقل محاسبے کی ضرورت ہے۔اب نہ پیغمبر تشریف لائیں گے نہ صحابہ جیسے نفوسِ قدسیہ میسر آسکیں گے لہٰذا اپنے کام،کارکردگی،ارادوں کا تنقیدی جائزہ مسلسل لینے کی ضرورت ہے۔ہم پر کوئی تنقید کرے تو اس تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے کیوں کہ تنقید کرنے والا اگر ہمارا مخالف،دشمن بھی ہے تب بھی اس کی تنقید ہمیں فائدہ دیتی ہے۔اور وہ ناقدین جو دین سے محبت رکھتے ہیں، دین کے لیے کام کرتے ہیں ان کی تنقید کو نہایت توجہ سے پڑھنا چاہیے بلکہ اس پر ناقد سے آزادانہ تبادلۂ خیال ہونا چاہیے اس سے تحریکوں،تنظیموں اور جماعتوں کو بے پناہ فائدہ ہوتا ہے لیکن عمومی مزاج یہ ہے کہ تنقید دیکھ کر ہم سب بدمزہ ہوجاتے ہیں لہٰذا اس تنقید کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ ہمارے بعض احباب نے ہمارا تعارف بعض عسکری تنظیموں اور ردعمل کی متشدد تحریکوں سے بھی کرایا مثلاً جماعت اسلامی کے سابق رکن صوفی محمد صاحب کی تحریکِ نفاذِ شریعت محمدی سے جس نے ضیاء الحق کے دور میں شہرت حاصل کی،تحریک کے نمائندے سے ہماری ملاقات مشرف دور میں ہوئی جب وہ سوات میں شریعتِ محمدی کا نفاذ اور شرعی عدالتوں کا قیام چاہ رہے تھے۔ہم نے ان سے پوچھا کہ اگر ریاست آپ کے مطالبات پورے نہ کرے تو آپ کیا کریں گے؟ جواب ملا جہاد۔ہم نے سوال کیا جہاد تو کافر ریاست کے خلاف کیا جاتا ہے لیکن آپ نے ابھی تک ریاست کی تکفیر نہیں کی تو جہاد کیسے ہوسکتا ہے؟ ان کے پاس کوئی جواب نہیں

تھا۔ ہم نے ان سے سوال کیا کہ آپ ایک کافر ریاست سے اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں یا ایک اسلامی امارت سے نظام اسلام کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ مطالبہ بھی مقامی کیوں ہے؟ شریعت صرف سوات میں کیوں؟ وہاں تو پہلے ہی شریعت نافذ ہے۔ FATA میں شریعت نافذ ہے۔ ان تمام علاقوں کی معاشرت، تہذیب، ثقافت، مزاج، عادات و اطوار، روایات، اقدار سب کچھ مذہبی ہے۔ یہاں تو صرف چند اصلاحات کی ضرورت ہے۔ بحیثیتِ مجموعی یہ علاقے اور ان کی معاشرت اسلام کا اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ آپ کراچی میں شرعی عدالت اور نفاذ شریعت کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ کراچی کا تقابل آپ شمالی علاقہ جات اور سوات سے کریں تو پہلے آپ کو کراچی پر توجہ دینی چاہیے۔ ان کا جواب تھا کہ کراچی ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ پاکستانی ریاست کو کفر کا حامی سمجھتے ہیں تو حامیان کفر سے آپ نفاذ شریعت کے مطالبات کیوں کر رہے ہیں؟ کیا اسلامی تاریخ اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں شریعت کفار حکمرانوں سے مطالبات کے ذریعے نافذ کرائی گئی کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا تو آپ آج کے حکمرانوں سے نفاذ شریعت کی بات کس اصول پر کر رہے ہیں؟ ان سے پوچھا کہ آپ جماعت اسلامی، جمعیت علماء پاکستان کے ساتھ گفتگو، تعاون کے لیے تیار نہیں کیوں کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ یہ جمہوری سیاسی جماعتیں ہیں اور جمہوریت کفر ہے لہٰذا ان جماعتوں سے بات چیت نہیں ہو سکتی لیکن آپ پاکستان کی جمہوری ریاست اور اس کی پارلیمنٹ سے شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس نے آپ کے مطالبات قومی اسمبلی سے منظور بھی کرا لیے ہیں تو کیا یہ بہت بڑا تضاد نہیں ہے؟ ان لوگوں کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا یعنی اصلاً یہ ردعمل کی تحریک تھی۔ کسی بات پر غصہ آیا آپے سے باہر ہوئے اور ہتھیار اٹھا لیے۔ اس عمل کی کوئی ٹھوس بنیاد، کوئی اصول، کوئی نظیر ان کے سامنے نہیں تھی۔

ٹی ٹی پی کے ساتھ مکالمہ

کچھ اسی طرح کا مکالمہ تحریکِ طالبانِ پاکستان کے ساتھ ہوا۔ ان کے حامی ہم سے TTP کی مالی، اخلاقی، سیاسی مدد حاصل کرنے تشریف لائے۔ ہم نے ان سے سوال کیا کہ

آپ کا ریاست سے اختلاف کیا ہے؟ یہ اختلاف کب شروع ہوا؟ اس اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟ روس سے جہاد کے وقت تو ریاست آپ کی مکمل پشت پناہی کر رہی تھی۔ اب ریاست کو کیا ہو گیا یا ریاست کیا ہو گئی؟ کہنے لگے ریاست کہتی ہے امریکہ سے جہاد نہ کرو۔ یہ جہاد نہیں فساد ہے۔ ہم امریکہ کے حلیف ہیں تم کو امریکہ سے نہیں لڑنے دیں گے۔ لہٰذا اب شریعت کا حکم بدل گیا ہے۔ انہوں نے خود کو امریکہ کا حلیف کہا ہے۔ ہم نے سوال کیا کہ پاکستانی ریاست تو اپنے آغاز سے ہی امریکہ کی آلہ کار ہے، امریکہ کی حلیف ہے اور اس نے بار بار امریکہ سے دوستی، امداد، قرضوں کا سامان کیا ہے تو اس وقت آپ نے ریاست کے خلاف جہاد کیوں نہ کیا؟ محمد علی جناح نے ۱۹۴۷ء میں امریکی صدر ٹرومین کو خط لکھا کہ ہم سب سے پہلے مدد کے لیے آپ کی طرف پھر برطانیہ کی طرف دیکھتے ہیں، ہمیں دو بلین ڈالر قرضے کی ضرورت ہے، جس کا زیادہ تر حصہ فوج کے لیے درکار ہے۔ جناح صاحب کا خط۔ کے عارف کی کتاب

K. Arif: *Pak America Relations, 2 Volumes*

کے پہلے حصے میں دوسرے صفحے پر موجود ہے۔ اسی کتاب میں امریکی سفیر کے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو اس نے پاکستان کی جغرافیائی صورتِ حال کے حوالے سے امریکا کو لکھے جس میں کہا گیا کہ کمیونزم کے خلاف جنگ میں پاکستان کو ہراول دستے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے، اسے عالمِ اسلام میں کمیونزم کو روکنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، اس کی جغرافیائی حالت کی وجہ سے ہمیں اس سے اچھے تعلقات رکھنا چاہئیں اور اس کی مدد کرنا چاہیے۔ ہم نے ان کی خدمت میں کتاب پیش کی، عبارات سنائیں، حوالے دکھائے، آپ بھی پڑھیے۔ امریکی سفیر نے ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو لکھا:

I believe it would be in our national interest to accord recognization to the new dominion of Pakistan.Pakistan will be the largest Muslim country in the world & will occupy one of the most strategic areas in the world.

(۱۷ر جولائی ۱۹۴۷ء دستاویز نمبر ایک ص ۳)

۲ر ستمبر ۱۹۴۷ء دستاویز نمبر ۳ وزیر خزانہ غلام محمد کی امریکی سفیر سے گفتگو۔ پڑھیے پہلی

جلد کا ص ۳

The minister said that the burden of protecting India has been placed on Pakistan.

اس گفتگو میں روس کا ذکر ہے، ہند کی طرف روس کے آنے کے خطرہ کا تذکرہ ہے اور اپنی خدمات امریکہ کو پیش کرنے کی آرزو ہے۔ یہ آغاز ہے اسلامی مملکت پاکستان کا جناح صاحب نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دستاویز نمبر چھ جلد اول ص ۵،۶ پر امریکی صدر کے نام خط میں لکھا:

She(Pakistan) has to look firstly to the USA & then to Great Britain for assistance. We would need a loan of two billion dollars from USA.

افغانستان، روس کی جانب سے خطرے کا ذکر کرتے ہوئے جناح صاحب کے خط میں لکھا گیا:

The proximity and vulnerability of Western
Pakistan to Russia, is the most threat, the
defence of India will become almost an
impossibility. If Pakistan is to become strong enough to defend itself, with Great Britain & the USA the inhabitants of Pakistan will rise up to any occasion when the occasion does come.What is needed is finance and more than that a regular source of finance.

اگر اسلامی ریاست کی امداد، طاقت، قوت کا سرچشمہ امریکہ اور عظیم برطانیہ تھے تو کیا کفار کی مدد سے دارالاسلام مضبوط کیا جاتا ہے؟ تحریکِ پاکستان میں ہندوستان کو دارالحرب کہا گیا اور پاکستان کو دارالاسلام مفتی شفیع صاحب کا فتویٰ مسلم لیگ نے تقسیم کیا لیکن اب صورت حال اچانک کیسے بدل گئی۔

امریکی سفیر نے تو علماء کے بارے میں امریکی صدر کو لکھا کہ یہ ہماری ماڈرن پاکستانی ریاست کے دشمن ہیں۔

Uneducated religious leaders (Mullahs) who oppose the present Western minded government and favour a return to primitive Islamic principles.

(دستاویز ۲۶ صفحہ ۴۶)

ہم نے کہا آپ کے علماء اور رہنماؤں کو تو پاکستان بنتے ہی اس کے خلاف جہاد شروع کر دینا چاہیے تھا لیکن آپ تو ستر سال تک خاموش رہے۔ اب اچانک ایسا کیا ہو گیا ہے کہ ریاست کے خلاف جہاد شروع کر دیا جائے؟ جواب ملا ہم جہاد نہیں کر رہے۔ ریاست کے خلاف خروج کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا خروج تو اسلامی امارت کے خلاف ہوتا ہے جہاں کا پبلک لاء شریعت اسلامی ہوتی ہے، صرف حکمران طبقہ کفرِ بواح کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے خلاف خروج کیا جا سکتا ہے لیکن خروج کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ پاکستان کو اسلامی امارت تسلیم کرتے ہیں۔ کہنے لگے نہیں ہم اسے کافر ریاست کہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا تو پھر خروج کیسے ہوا اس کے خلاف تو جہاد ہوگا اور جہاد کی شرائط امت کے فقہاء نے طے کر دی ہیں جہاد بھی اسی کے مطابق ہوگا۔ ہم نے پوچھا چلیے مان لیا کہ خروج کرنا ہے تو خروج ہمیشہ کسی شخص کے خلاف ہوتا ہے جو امیر، خلیفہ، حاکم ہوتا ہے یعنی وہاں جہاں شخصی حکومت ہو۔ پاکستان تو جدید ریاست ہے یہ شخصی حکومت نہیں تو خروج کس کے خلاف کریں گے صدر، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، چیف جسٹس، آرمی چیف، اراکین صوبائی وقومی اسمبلی؟ کہ یہ سب ریاست کے ستون ہیں اور ان اراکین اسمبلی کو بھی عوام نے منتخب کیا ہے تو کیا ان ووٹروں کے خلاف بھی خروج ہوگا جنھوں نے ان نمائندوں کو منتخب کر کے قومی وصوبائی اسمبلیوں میں بھیجا؟ تو آپ کا خروج پاکستان کے تمام لوگوں کے خلاف ہوگا، طاقت کے تمام مراکز کے خلاف ہوگا؟ تو کیا آپ کے پاس اتنی قوت، طاقت اور افراد ہیں جو سترہ کروڑ (موجودہ ۲۵ کروڑ) لوگوں سے لڑ سکیں؟

جدید ریاست کے خلاف جہاد نہیں ہو سکتا

جدید ریاست کے خلاف تو خروج ہو ہی نہیں سکتا، اس کے خلاف تو انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ چین، روس، امریکا، فرانس، ایران، کیوبا میں آیا۔ آپ اکیسویں صدی

کی جدید ریاست سے واقف ہی نہیں ہیں۔ کہنے لگے نہیں یہ کافر ریاست ہے، ہم اس کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ ہم نے سوال کیا کہ جہاد آخری چارۂ کار ہے جب تمام راستے بند ہو جاتے ہیں تو آخری میدان جہاد کا ہوتا ہے یعنی ہم غازی بن کر زندہ رہیں گے یا شہید ہو جائیں گے۔ آپ تو کئی بار مذاکرات کے لیے جہاد کو ملتوی کر چکے ہیں۔ آج کل مولانا سمیع الحق اور پروفیسر ابرہیم کے ذریعے آپ حکومت سے صلح کی بات کر رہے ہیں جہاد میں تو جہاد ہوتا ہے مذاکرات نہیں ہوتے۔ اسلامی تاریخ میں کفار سے جہادی مذاکرات کا ثبوت نہیں ملتا۔ جہاد کے اعلان کے بعد صرف جہاد ہوتا ہے مذاکرات نہیں۔

اسلامی تحریکوں کو ہم یہ تفصیلات اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ وہ اپنے دلائل کا ازسرنو جائزہ لیں۔ جذبات میں، غصے میں، اشتعال میں، جوش خطابت میں اعتدال کی روش برقرار رکھیں۔ یہ سوچیں کہ ان کے دلائل کتنے کمزور ہیں اور ان دلائل میں کس قدر تضاد ہے۔ ان دلائل کو سننے والا صرف حیرت زدہ ہی ہوسکتا ہے۔

کیا دعوتی سیاسی جماعتیں انقلابی ہیں؟

ایک دعوتی سیاسی انقلابی جماعت کے ایک اہم رہنما سے ہم نے پوچھا کہ آپ کی جماعت اگر ایک انقلابی جماعت ہے تو کیا وہ سیاست کے ذریعے انقلاب لانا چاہتی ہے جس طرح جرمنی اور روس میں آیا کہ انتخابات میں کامیاب ہوتے ہی اعلان کر دیا گیا کہ ہم جمہوریت کا خاتمہ کرتے ہیں؟ یا آپ امریکہ، فرانس، چین، کیوبا، ایران کی طرح انقلاب لانا چاہتے ہیں تو وہ ہمارے سوالات کا جواب نہیں دے سکے۔ ہم نے عرض کیا اگر انتخابی سیاسی عمل میں مستقل اور مسلسل حصہ لیتے رہنے کا نام انقلاب ہے تو جمعیت علماء پاکستان، تحریک لبیک پاکستان اور جمعیت علماء اسلام تمام انقلابی جماعتیں ہیں جو سیاسی عمل میں مسلسل شریک ہیں اور کبھی یہ نہیں کہتیں کہ ہم جمہوریت کو ایک آلے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، اگر ہم کامیاب ہو گئے تو اس پورے نظام کو روس جرمنی کی طرح الٹ دیں گے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ دعوتی جماعت تو ہر ایک کو انبیاء علیہم السلام کی طرح دعوت دیتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی طرح بار بار اپنی امت سے کہتی ہے کہ اے لوگو ہماری دعوت جو اللہ کی دعوت ہے اسے قبول کر لو، ہم تم سے

اس کا کوئی صلہ کوئی بدلہ نہیں چاہتے لیکن آپ ایک طرف دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف انتخابی عمل میں شریک ہو کر کسی کے حریف بھی بن رہے ہیں داعی کسی کا حریف نہیں ہوتا یہ تو متضاد (Oxymoron) رویہ ہے وہ جواب تو نہیں دے سکے لیکن ان کا بڑا پن یہ تھا کہ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس موضوع پر پڑھیں گے، اپنے اکابرین سے بات کریں گے اور پھر ہمیں جواب دیں گے۔

اسلامی تحریکوں کے اکثر لوگوں کا حال ایسا ہی ہے لہٰذا ہماری تمام اسلامی تحریکوں جماعتوں سے جو عقیدہ اہل سنت والجماعت پر ایمان رکھتی ہیں یہی استدعا، عرض، درخواست، التجا ہے کہ اپنی جماعت کے اہداف ومقاصد کے لیے شرعی دلائل مہیا کریں صرف جذبات کو مخاطب نہ بنائیں۔

ٹی ٹی پی سے مکالمہ

'پیغام پاکستان' والے فتوے کے حوالے سے ہمیں ڈان کے کالم نگار عامر رانا کا ایک کالم یاد آیا جس میں رانا صاحب نے لکھا تھا کہ جنرل باجوہ نے اشرف غنی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ 'پیغام پاکستان' کی تدوین کے بعد علماء سے افغانستان کے لیے بھی فتویٰ دلوائیں گے کہ جس طرح پاکستانی حکومت کے خلاف جہاد جائز نہیں اسی طرح افغان مسلم حکومت کے خلاف بھی جہاد جائز نہیں کیونکہ افغانستان ایک مسلم ملک ہے اور اس کی فوج مسلمان فوج ہے۔ لیکن پاکستانی علماء نے افغانستان کے حق میں فتویٰ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ افغانستان دوسرا ملک ہے ہمارا اس سے کیا واسطہ؟ ہم صرف پاکستان کے بارے میں فتویٰ دے سکتے ہیں اس طرح باجوہ صاحب کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی 'پیغام پاکستان' کے فتوے کے باوجود TTP اور پاکستانی ریاست میں صلح نہ ہو سکی۔ افغانستان سے امریکہ کی پسپائی کے بعد TTP دوبارہ سرگرم عمل ہوئی۔ حکومت پاکستان نے افغان حکومت سے درخواست کر کے TTP کی قیادت سے کابل میں براہِ راست مذاکرات کیے لیفٹیننٹ جنرل فیض حمید ایک ہفتے تک کابل میں مذاکرات کرتے رہے لیکن مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب کی طالبان قیادت سے ملاقات ہوئی لیکن وہ مفتی صاحب کے دلائل سے متفق نہیں ہوئے۔ ہماری

ملاقات کابل کے مذاکرات میں شریک طالبان کے ایک رہنما سے ہوئی۔ موضوع یہ تھا کہ کیا TTP اور فوج میں صلح ممکن ہے اگر ممکن ہے تو کس طریقے سے؟ ہم نے عرض کیا صلح و جنگ آپ کا موضوع ہے اور فوج کے جنرل فیض حمید سے آپ کی بات چیت کامیاب نہ ہوسکی تو ہم آپ کو کیا تجویز دے سکتے ہیں؟ لیکن چند سوالات ہیں جو ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر افغانستان میں کرزئی اور اشرف غنی کی حکومت نہ ہوتی تو کیا آپ پاکستانی ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھاتے؟ وہ خاموش رہے۔ ہم نے پوچھا پاکستانی ریاست آپ کو تاریخ کے کس موڑ پر کافر نظر آئی یعنی افغان طالبان کے وجود میں آنے اور امریکہ سے لڑنے کے نتیجے میں ہی آپ کو ریاست پاکستان غیر اسلامی محسوس ہونے لگی؟ اس سے پہلے ستر سال تک آپ کو اور آپ کے حامی علماء کو یہ ریاست اسلامی کیوں محسوس ہوتی رہی؟ آپ میں اور آپ کے مکتب فکر کے علماء میں اختلاف کیوں ہو گیا؟ پھر اچانک یہ احساس اتنی شدید نفرت میں کیوں بدل گیا؟ طالبان سے رابطے نے اور امریکہ کے خلاف طالبان کے جہاد نے اور امریکی حکومت کے حامی کرزئی اور اشرف غنی کی حکومتوں کو امریکی نواز حکومت سمجھنے کے بعد ہی آپ کو پاکستان کی دینی حیثیت کے بارے میں شک ہوا، کیا یہ بات درست ہے؟ جواب میں کہنے لگے کہ ہم پاکستان کو پہلے دن سے اسلامی ریاست نہیں مانتے۔ ہم نے عرض کیا یہ تو آپ کا دعویٰ ہے۔ آپ کے اکابرین نے تو اسے اسلامی ریاست ہونے کی بار بار سند دی ہے بلکہ علماء تو کہتے ہیں کہ پاکستان ہم نے بنایا۔ کہنے لگے انھیں بھی غلط فہمی ہوئی تھی مگر یہ غلط فہمی جلد دور ہوگئی۔ علماء کو پتہ چل گیا تھا بلکہ ہمارے بہت سے علماء پاکستان بنتے ہی اس ملک کی اصل حقیقت سے واقف ہو بھی گئے تھے لیکن حالات ایسے تھے کہ اس وقت اس کی حقیقت عوام پر واضح کرنا نئے فسادات پیدا کرتا۔ تقسیم کو لوٹایا نہیں جا سکتا تھا مثلاً جناح صاحب کی ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر جس میں انہوں نے کہا کہ اب یہاں پاکستان میں نہ ہندو ہندو رہے گا نہ مسلمان مسلمان۔ مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں، یہ ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے ریاست اس معاملے میں غیر جانبدار رہے۔ یہ تقریر ہی نظریہ پاکستان کی نفی تھی اور اس فتوے کا بھی انکار تھا جو تحریک پاکستان میں مفتی محمد شفیعؒ نے لکھا اور لاکھوں کی تعداد میں تقسیم ہوا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور پاکستان دارالاسلام۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے جناح صاحب کی گیارہ اگست کی تقریر کے

خلاف نہایت سخت بیان اخبارات کو جاری کیا۔ یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا۔ مرکز مطالعۂ تاریخ لاہور پنجاب یونیورسٹی کی کتاب ''پاکستان میں ملائیت کا آغاز'' مرتبہ ڈاکٹر جعفر میں یہ بیان موجود ہے۔ یہ بیان ثبوت ہے کہ علماء کو گیارہ اگست کی تقریر سے ہی کھٹکا لگ گیا تھا ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان میں اسلام کا ذکر نہیں ہے۔ پاکستان کے قومی ترانے میں اسلام کا ذکر نہیں ہے۔ یہ ترانہ موسیقی پر گایا گیا۔ اس ملک میں جو دس لاکھ شہیدوں کے خون سے بنا تھا علماء نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی۔ یہ پاکستان کا آغاز تھا۔ وزارتیں بنیں تو کسی ایک مولوی کو کابینہ کا رکن نہیں بنایا گیا، نہ وزارت دی گئی حتی کہ کسی اسلامی ملک کی سفارت کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا، قاضی عدالت بحال نہیں کی گئی، جس کے لیے کسی ترمیم یا منصوبہ بندی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک قادیانی اور ایک ہندو کو وزیر بنایا گیا، کسی مولوی کو وزارت نہ ملی۔ ۱۹۷۷ء تک پاکستانی فوج میں شراب چلتی تھی ضیاء الحق نے آ کر شراب پر پابندی لگائی سرکاری افسران فوجی سب شراب پیتے تھے۔ امیر المومنین جناح صاحب کے پورے دورِ حکومت میں شراب چلتی رہی شراب تک بند نہ کر سکے۔

۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں جناح صاحب نے صاف الفاظ میں کہا کہ ہم پاکستان میں اکبر کی عظیم ترین رواداری کے اصولوں کو زندہ کریں گے۔ علماء اکبر کی رواداری سے اچھی طرح واقف ہیں۔ نام دارالاسلام لکھا گیا اور جناح صاحب نے امیر المومنین کی حیثیت سے اور اس کے بعد تمام حکمران مالی امداد کے لیے پہلے امریکہ پھر عظیم برطانیہ کی طرف دیکھتے رہے آزادی برطانیہ سے، کفار سے ملی تھی تو ان کفار سے، امداد اور کفار سے قرضے کیوں مانگے جا رہے تھے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا ملک تھا پاکستان جہاں اسلام نافذ نہیں کرتے تھے مگر اوپر سے نیچے تک اسلام پر لوگ باتیں کرتے رہتے تھے۔ ستر سال سے مغرب سے ہم قرضے لے رہے ہیں، ہماری سڑکیں، پل سب کافروں کے قرضے سے بنا ہے، اس ملک کے نام میں صرف اسلامی لکھا ہوا ہے، بس۔ مَیں تو یہ سوچ کر حیران ہوں کہ اس دارالاسلام میں نوے سال سے آج تک کوئی ٹرین کبھی نماز کے لیے نہیں روکی گئی۔ ٹرین نماز کے لیے نہیں رک سکتی، جانے کی اتنی جلدی ہے۔ پورا ملک سر سے پیر تک قرضے میں ڈوبا ہوا ہے کفار سے معاہدوں میں جکڑا ہوا ہے (۸۰) اسی فیصد عوام پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھا سکتے حالانکہ یہ زرعی

ملک ہے۔ ملک میں کپڑا بنتا ہے مگر لوگ ننگے نظر آتے ہیں، ان کے جسم پر کپڑا نہیں۔ کراچی میں ایک ایک کمرے کے گھر میں آٹھ آٹھ لوگ رہتے ہیں، لوگ شہر میں پانی کے لیے ترستے ہیں پانی خریدتے ہیں جب کہ پانی، نمک اور چراگاہ کو فروخت نہیں کیا جا سکتا اور نظریۂ پاکستان تو لیاقت نہرو پیکٹ کے بعد ہی ختم ہو گیا جب دونوں نظریاتی ملکوں کے نہرو اور لیاقت علی خان نے جناح صاحب کی گیارہ اگست کی تقریر کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کہا کہ ۱۹۵۰ء کے بعد ہندوستان سے کوئی مسلم پاکستان نہیں آئے گا نہ کوئی ہندو ہندوستان جائے گا۔ یہ سب پاکستان اور ہندوستان کے شہری ہیں اپنے ملکوں میں رہیں گے۔ بھارت میں مسلمانوں کی عزت، مال، دولت کی حفاظت ہندو نہرو کرے گا یعنی پیکٹ کے ذریعے بتا دیا گیا کہ پاکستان جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے بنایا گیا تھا اب اس ملک میں کوئی ہندی مسلمان نہیں آ سکتا اب یہ قومی ریاست ہے دارالاسلام نہیں ہے۔ طبقاتی کشمکش کا اس ملک میں کیا حال ہے اس کی صرف ایک مثال دیتا ہوں کہ آپ کو ائیر پورٹ سے لاہور، سعودی عرب جانا ہے تو آپ کراچی ائیر پورٹ میں موٹر سائیکل، اسکوٹر، رکشہ لے کر اوپر نہیں جا سکتے وہاں صرف گاڑیاں جا سکتی ہیں۔

ہم نے سوال پوچھا کہ پاکستان پہلے دن سے قرض پر، امریکی امداد پر، سود پر چل رہا ہے تو کیا یہ سب کچھ ایک دن میں آپ کے لیے ختم کرنا ممکن ہے؟ آپ کو اقتدار دے دیں تو آپ ان تمام برائیوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں جو آپ نے بتائی ہیں؟ نہیں ہم ختم تو نہیں کر سکتے۔ ہم نے پوچھا ہر مسئلے کا حل فوری ہونا چاہیے یا مسئلہ حل کرنے میں کچھ وقت بھی لگتا ہے؟ کہنے لگے وقت لگتا ہے۔ ہم نے کہا اصولی طور پر جتنی باتیں کی گئی ہیں وہ سب درست ہیں لیکن کیا اس کے حل کا صرف ایک ہی طریقہ ہے عسکری جدوجہد؟ کیا اس ایک طریقے کے ساتھ دوسرے طریقے نہیں کام کر سکتے؟ عسکری جدوجہد کے لیے عوام کا تعاون ضروری ہے جیسے افغانستان میں تھا کیا آپ کی جدوجہد میں عوام شامل ہیں طالبان کے ساتھ تو عوام بیس سال تک قربانیاں دیتے رہے؟ انھوں نے پوچھا ہمیں راستہ بتائیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہم نے عرض کیا جتنے سوالات پوچھے ہیں ان سب کا جواب تلاش کر کے لائیے، ان مسائل کا حل سوچ کر آئیے ہم آپ کو راستے بتا دیں گے۔ کہنے لگے ہمارے خلاف پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ ہم دہشت گرد ہیں کیا یہ درست ہے؟ ہم نے پوچھا کہ جئے سندھ تحریک پاکستان دشمن تحریک ہے۔ کیا ریاست

نے اسے دہشت گرد کہا ہے؟ پختون قومی موومنٹ قومی اسمبلی کی رکن بھی ہے۔ ریاست کے خلاف بول رہی ہے تو کیا ریاست نے اسے دہشت گرد کہا ہے؟ کیا بلوچوں کو ریاست نے دہشت گرد کا خطاب دیا ہے جو تمام بلوچ مسلح تنظیموں کے مکمل حامی ہیں پاکستان سے نفرت کرتے ہیں فوج کو گالیاں دیتے ہیں آزاد بلوچستان کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ بلوچستان کو کیک میں سے بڑا حصہ دیا جائے جب ان سب کو دہشت گرد نہیں کہا جا رہا تو امریکی اصطلاح صرف TTP کے خلاف کیوں استعمال ہو رہی ہے؟ کیا آپ نے جنرل فیض حمید سے یہ سوال کیا تھا؟ ۹/۱۱ کے بعد دہشت گرد کی اصطلاح صرف طالبان کے لیے امریکی صدر بش نے ایجاد کی تھی اور کہا تھا کہ دنیا یا امریکہ کے ساتھ ہو جائے یا دہشت گردوں کے ساتھ۔ اِدھر یا اُدھر درمیان کا کوئی راستہ نہیں۔ طالبان سے مذاکرات نہیں ہوں گے آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جنگ جاری رہے گی لہٰذا ہم تو دہشت گرد کی اصطلاح کو نہیں مانتے۔ TTP والے ہمارے ناراض بھائی ہیں اور ناراض بھائیوں کو منایا جاتا ہے۔ ان سے مذاکرات اور مسلسل مذاکرات کے ذریعے معاملات طے کئے جا سکتے ہیں۔ ہمارا جہاں تک مطالعہ اور معلومات ہیں وہ یہ کہ صرف دو سوالات ہیں جن کے جوابات نہ علماء کے پاس ہیں نہ فوج کے پاس ہیں اگر ان دو سوالات کا طالبان TTP کو درست طریقے سے جواب دے دیا جائے اپنی غلطی، کمزوری، مجبوری، طالبان کے سامنے کشادہ دلی، سچائی سے رکھ دی جائے تو طالبان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن علماء نے اور ریاست نے ان سوالوں پر توجہ ہی نہیں دی۔

زرعی انقلاب بھی فوج کے ذمہ

ریاست نے آرمی ایکٹ میں سینٹ کے ذریعے ترامیم کر کے فوج کو قومی ترقی میں اہم کردار سونپ دیا ہے لیکن ایکٹ میں اس قومی ترقیاتی کردار کی کوئی تشریح نہیں کی گئی ہے دوسرے معنوں میں ایوب خان کا دور، اس دور کا زرعی انقلاب دوبارہ فوج کے ذریعے ہی لایا جا رہا ہے لیکن منظر پر جمہوری حکومت موجود ہے۔ فوج کے اس قومی کردار کے لیے نئی اصطلاح استعمال کی گئی Green initiative یہ اصطلاح خانیوال میں ماڈل ایگریکلچرل فارم کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے جنرل عاصم منیر نے استعمال کی۔ ٹریبیون نے اس واقعے کی خبر لگائی

COAS sets sight on agri revolution

ماڈل فارم کی تقریب کے صدر جنرل عاصم خود تھے۔انہوں نے کسانوں سے فرمایا سیکورٹی اور معیشت میں چولی دامن کا ساتھ ہے زرعی انقلاب آ کر رہے گا۔

Green initiative کا یہ دائرہ پورے پاکستان میں پھیلایا جائے گا۔انہوں نے کہا کہ فوج کو قوم کی خدمت کرنے پر فخر ہے، ہم زرعی انقلاب لائیں گے۔ہم اس ماڈل فارم کی طرز کے جدید فارم بنائیں گے، کشکول باہر اٹھا کر پھینک دیا (روزنامہ جنگ کراچی ص6، ۲۵ جولائی، ۲۰۲۳)

آرمی ایکٹ میں ترمیم سے فوج کے معاشی، ترقیاتی کردار کو آئینی، قانونی، جمہوری، ریاستی تحفظ بھی حاصل ہو گیا۔سینیٹر رضا ربانی اور عامر بزنجو نے آرمی ایکٹ میں ترامیم کی شدید مخالفت کی اور واک آؤٹ کیا ایکٹ کی ترامیم سے ثابت ہوا کہ جمہوریت، جمہوری سیاست، جمہوری حکمران، جمہوری نظام بالکل ناکام ہو چکے ہیں اور فوج کو براہ راست کردار ادا کرنے کے لیے منظر پر آنا پڑا ہے۔یہ صورتِ حال مذہبی سیاسی جماعتوں کے لیے غور و تدبر کا تقاضا کرتی ہے۔ان کی سیاست کے لیے جو کچھ دائرہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا ہے۔اب فوج قومی امور کا حصہ ہے آپ کا کام کٹ پتلی تماشہ ہے؟ کیا آپ اس کام پر راضی ہیں یا کوئی انقلابی حکمت عملی وضع کرنے کے لیے تیار ہیں؟ جمہوری سیاست کا حشر آرمی ایکٹ ترامیم کے بعد بالکل واضح ہے۔

مذہبی سیاسی جماعتیں جو پاکستان کو فلاحی ریاست بنانے کے موہوم دعوے پر ستر سال سے اپنی سیاست چلا رہی ہیں اب ان کے لیے فلاحی نعرہ بھی بے معنی ہو گیا۔کیوں کہ یہ نعرہ فوج نے اختیار کر لیا ہے۔قومی ترقیاتی کام فوج براہ راست یا بالواسطہ کرے گی، آرمی ایکٹ میں یہ ترمیم کر دی گئی ہے۔مذہبی جماعتیں کشکول توڑنے کا دعوہ کرتی تھیں۔جنرل عاصم منیر نے کہہ دیا کہ ہم نے کشکول باہر اٹھا کر پھینک دیا ہے۔مذہبی جماعتوں کے پاس تو اب پھینکنے کے لیے بھی کچھ نہ رہا۔ان کے لیے اب ایک ہی راستہ ہے کہ وہ جمہوری سیاست کے متبادل بے شمار راستوں پر کام کریں جو موجود ہیں، میسر ہیں، مہیا ہیں، فائدہ مند ہیں، انقلاب کو ممکن بنا

سکتے ہیں۔نظام پہلے Implode ہوتا ہے پھر Explode ہوتا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت

علماءکرام اور مذہبی سیاسی جماعتوں کو یادرکھنا چاہئے کہ چیف جسٹس ثاقب نثار کے دور میں فوج اور پاکستانی ریاست نے ملا طارق جمیل کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کا نعرہ لگوایا تھا اور طارق جمیل صاحب نے ''دو ہی بچے سب سے اچھے'' کے نعرے کی تصدیق بھی اسلام سے فرمائی تھی۔اس کانفرنس کے بعد دیوبندی علماء کی جانب سے مولانا طارق جمیل کا شدید معاشرتی مقاطعہ کیا گیا اور انہیں منظر سے ہٹا دیا گیا۔بنیادی سوال یہ تھا کہ چیف جسٹس آف پاکستان ثاقب نثار کو خاندانی منصوبہ بندی پر سیمینار کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟حکم انہوں نے ہی دیا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ نواز شریف کو برطرف کرو۔موجودہ چیف جسٹس عطا محمد بندیال نے بھی خاندانی منصوبہ بندی پر ایک سیمینار پر خطاب کیا اور اسے پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک قرار دیا۔یعنی ثاقب نثار کا طے کردہ راستہ جو ریاست نے طے کیا تھا اس پر سفر جاری ہے سابق وزیر خزانہ مفتاح اسماعیل بھی کہہ چکے ہیں کہ ہمیں انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کی طرح آبادی کم کرنا ہوگی اور اب سینیٹر ڈاکٹر ثانیہ نشتر کا بھی بیان آچکا ہے۔

Exploding population threatens prosperity of our generation.

ریاست نے پالیسی طے کر دی کہ انڈونیشیا اور بنگلہ دیش اس کے لیے آئیڈیل ہیں۔ وہاں کی طرح آبادی کو علماء کے فتویٰ اور مذہب کے ذریعے کنٹرول کرنا ہے۔پاکستانی علماء آج کی تاریخ تک خاندانی منصوبہ بندی کو حرام سمجھتے ہیں لیکن کیا مستقبل میں جب ریاست نئے ''پیغامِ پاکستان'' کے لیے انھیں بلائے گی تو کیا یہ ریاست کی بات ماننے سے انکار کر دیں گے؟ یہ ہے اصل سوال جس پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو آج سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

بنگلہ دیش انڈونیشیا میں علماء کو سمجھا کر،منا کر،ورغلا کر،بہلا کر،اعداد وشمار کی بہار دکھا کر زور زبردستی سے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں فتوے لیے گئے۔کیا پاکستان کی مذہبی تحریکیں،مذہبی سیاسی جماعتیں ریاست کا مقابلہ کر سکیں گی؟یا ''پیغامِ پاکستان'' کی طرح نئے پیغام پاکستان پر دستخط کر دیں گی؟پیغام پاکستان میں علماء نے ریاست کو جہاد کا اختیار دیا حالانکہ

کہ آئین پاکستان کے تحت ریاست جہاد نہیں کرسکتی صرف اپنا دفاع تحفظ کرسکتی ہے۔ حیرت ہے کہ علماء نے آئین پڑھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی اور ریاستی دباؤ میں آکر دستخط کردیئے۔

دینی مدارس فوج کی مجبوری ہیں

وہ علماء جو بار بار اپنی سادہ لوحی سے بتاتے ہیں کہ ہم اسمبلی میں ہیں، PDM میں ہیں حکومت کے ساتھ بیٹھے ہیں تو یہ مدارس کے تحفظ کے لیے ہے۔ یہ سب حقیقت نہیں سادہ لوحی بلکہ بے حد غلط اندازے ہیں۔ ان علماء کا یہ بھی استدلال ہے کہ اگر ہم پارلیمنٹ میں، PDM میں، PPP اور مسلم لیگ کے ساتھ نہیں ہوتے، جمہوری سیاست میں، اتحادی سیاست میں، ملٹری کے ساتھ نہیں ہوں گے تو ریاست ہمارے مدارس کو بند کردے گی ان کا خاتمہ کردے گی اس کے لیے وہ ترکی کے کمال اتاترک کی مثال دیتے ہیں کہ اس نے مدارس وعلماء کے ساتھ کیا کیا۔ پاکستان کا کمال اتاترک جنرل مشرف جو بڑے فخر سے کہتا تھا کہ میرا ہیرو کمال اتاترک ہے مدارس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ مدارس پاکستانی ریاست اور فوج کی کمزوری ہیں، مجبوری ہیں، ان کے بغیر بھارت کے خلاف مزاحمت نہیں ہوسکتی اور جہاد کے عقیدے کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ہمیں حیرت ہے کہ مذہبی جماعتوں کو اپنی قوت کا اندازہ ہی نہیں۔ یہ قوت فوج اور ریاست کی مجبوری ہے پاکستان ترکی نہیں ہے، اس کے پڑوس میں بھارت ہے اس کے پڑوس میں افغانستان اور ایران ہے۔ ان تین ملکوں سے پاکستان کے تعلقات ہمیشہ خراب رہے ہیں ان تین ملکوں کی موجودگی میں فوج کا کوئی جنرل کمال اتاترک نہیں بن سکتا۔ یہ پاکستان ہے ترکی نہیں ہے، علماء کو اپنی قوت کا خود بھی اندازہ نہیں ایک کتاب پڑھیں:

Tinder Box

قومی مالی مفاد کو دینی مفاد پر ترجیح

آج کل اخبارات میں خبریں آرہی ہیں کہ ریاست سول ایوی ایشن اتھارٹی، شپ یارڈ وغیرہ کو Outsource کررہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمام ادارے یا ان اداروں کے جو حصے Outsource ہوں گے اس کے مالک چین، یو اے ای، سعودی عرب، روس ہوں گے پاکستان نہیں۔ دوسرے معنوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم پہلے برطانیہ کی، پھر

امریکہ کی، پھر یورپ کی، آج کل چین اور روس کی استعماری طاقتوں کی غلامی میں مبتلا ہیں، اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے، سعودی عرب، یو اے ای اور دوسرے ملکوں کا نام بھی آرہا ہے۔

پاکستان ستر سال تک اپنے منفرد جغرافیائی خطے کی وجہ سے عالمی طاقتوں کے لیے ایک اہم مہرہ ثابت ہوا لہٰذا ستر سال تک پاکستان اپنے جغرافیہ سے معاش کماتا رہا لیکن اب وہ وقت باقی نہیں رہا۔ کمیونزم کا خطرہ ختم ہوگیا۔ امریکہ خطے میں نئی جنگ نہیں چاہتا۔ سیٹو، سینٹو کا کردار بھی ختم ہوگیا۔ دنیا پر مغرب اور امریکہ کی کامل حاکمیت قائم ہے، خطے میں نئی جنگ کے امکانات نہیں لہٰذا پاکستان اب اپنی محنت، حکمت سے تو معاش کما سکتا ہے اپنے جغرافیہ سے نہیں۔ مذہبی سیاست کا تو ان موضوعات سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ وہ عالمی، علاقائی مسائل سے بھی لاتعلق ہیں ان کی سیاست پاکستانی ریاست کے تابع ہے مثلاً سعودی عرب اور مسئلہ کشمیر۔ سعودی عرب میں اسلام سے کیا کیا انحراف ہو رہا ہے پوری دنیا کو معلوم ہے۔ ایک جدید اسلام تخلیق کیا جا رہا ہے۔ MBS کا فرمان ہے کہ میں سعودی عرب کو یورپ بنا دوں گا، کسی سعودی کو یورپ جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ حیرت ہے کہ اس پر موحدین کی کسی جماعت کی طرف سے ایک لفظ بھی تنقید کا نہیں آیا۔ قرآن وحدیث کے مطالب تبدیل کئے جا رہے ہیں لیکن عالم اسلام میں سناٹا ہے پاکستان کے تمام مکاتب فکر کی دینی سیاسی جماعتیں سعودی عرب کے دینی، ملی مسئلے سے بالکل لاتعلق ہیں کیونکہ ریاست بھی لاتعلق ہے اور وہاں سے ہمیں معاشی، مالی، مادی امداد بھی مل رہی ہے۔ قومی مفاد غالب ہے۔

یہی حال چین کا ہے چین میں دنیا کی سب سے بڑی جیل بنائی گئی ہے جس میں دس لاکھ مسلمان قید ہیں لیکن پاکستانی ریاست کو جس طرح سعودی عرب کی تبدیلیاں نظر نہیں آرہیں اسی طرح چینی ریاست کا ظلم وتشدد بھی نظر نہیں آرہا۔ پاکستان کی مذہبی اور مذہبی سیاسی جماعتیں جو کشمیر کے مسئلے پر مسلسل جلسے، جلوس، بیانات کی سیاست کرتی ہیں چین کے مسئلے پر خاموش ہیں۔ کسی مذہبی سیاسی جماعت نے آج تک چین کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا، کوئی جلوس نہیں نکالا اسلامی جمعیت طلباء یا کسی مذہبی طلباء تنظیم نے پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں چین کے خلاف احتجاجی جلوس نہیں نکالے کیوں کہ چین سے CPEC معاہدہ ہے۔ مالی مادی معاشی فائدے ہیں۔ ہم اپنے ملکی وعلاقائی قومی مفاد کو دیکھیں یا اسلامی مفاد کو دیکھیں۔ PDM کے مولانا فضل الرحمان

فرماتے ہیں کہ CPEC تو ہم نے شروع کیا۔ظاہر ہے چین کی مخالفت میں بیان کیسے آسکتا ہے؟ قومی، ریاستی مفاد اخلاقیات سے کس قدر عاری اور کس قدر سنگدل ہوتا ہے اس کی مثال نہیں ہے۔ UNO میں چین کے خلاف انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی قرارداد آئی تو پاکستان سمیت دنیا کے بہت سے اسلامی ملکوں نے بیان دیا کہ چین پر امریکہ کا الزام غلط ہے وہاں مسلمان چین وسکون سے ہیں، ان کے بنیادی حقوق پامال نہیں ہورہے۔قومی، علاقائی، مقامی مفاداتی سیاست، اسلامی سیاست امت اور ملت کو کس طرح تہس نہس کرتی ہے۔

فوجی بجٹ سے علماء بے خبر

مغرب کی جدید سائنسی ترقی میں فوج،فوج کے بجٹ کا بھی حصہ ہے رابرٹ اوپن ہائمر Robert Oppenheimer کے Manhattan Project کے لیے امریکی حکومت نے اربوں روپے دیئے۔ ایٹم بم بنا، ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر پھینکا گیا۔ بم مغرب یورپ گوری چمڑی والے مہذب ملک جرمنی پر نہیں، جاپان پر پھینکا گیا۔ پیلے رنگ والوں پر۔ یہ بھی مغرب کا تعصب تھا اور مغرب کو جوہری خطرے سے بچانا بھی تھا۔ مین ہٹن پراجیکٹ کے بعد مغرب میں ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کی اصطلاح کو جانا گیا۔ آئزن ہاور نے ۱۹۶۱ء کی سالانہ صدارتی تقریر میں ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کی اصطلاح استعمال کی تو یہ اصطلاح عام ہوگئی۔ اب دنیا کی ہر قوم کے پاس ایسے کمپلیکس ہیں۔ وہ کیا کررہے ہیں؟ یہ صرف ریاست کو پتا ہے۔ ان کے بجٹ بھی ریاست ہی جانتی ہے۔ سب خفیہ ہوتے ہیں۔ امریکہ کے وفاقی بجٹ کے پچاس فی صد صوابدیدی فنڈ پینٹاگون استعمال کرتی ہے۔

The Pentagon and the US war machinery now uses up over half of the Federal discrediting budget.[NewYork Times 2-7-23]

وجے مہتا کی کتاب Economics of Mass Killing اس موضوع پر عمدہ کتاب ہے۔انڈسٹریل کمپلیکس کس طرح کام کرتے ہیں؟ اس کی تفصیل دو کتابوں میں ملتی ہے۔

1- Ayesha Siddiqa, Military Inc

2-Tan Tai Yong,The Garrison State

ہمیں حیرت ہے کہ ہماری کسی مذہبی سیاسی جماعت نے کبھی ان مباحث کو اپنے اندرونی حلقوں میں بھی بحث کا موضوع نہیں بنایا۔ ان مباحث کے بغیر وہ ایک قومی ریاست کی قیادت حاصل کر کے عالمی سیاست سے اپنا قومی حصہ کیسے وصول کر سکتی ہیں؟ امریکہ کی کابینہ میں دو وزیر CIA سے لیے جاتے ہیں جو کابینہ کو خفیہ کارروائیوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ چین کے قومی سلامتی کے ۲۴ اراکین میں سے ۵ کا تعلق فوج سے ہوتا ہے۔ فوج آپ پر کس طرح راج کرتی ہے یہ تو آپ کے علم میں ہی نہیں۔

مافیاز کا کردار

اس وقت پاکستان، افغانستان، بھارت کے جو معاملات ہیں ہم ان سے بھی واقف نہیں۔ پاکستان افغانستان میں ایسے معدنی ذخائر اتنی بڑی تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں کہ دنیا حیران ہے تیل کے ذخائر نکل آئے ہیں۔ اس بات کا امکان ظاہر کیا جا رہا ہے کہ 2027 تک پاکستان باہر سے تیل کی خریداری بند کر دے گا۔ بھارت کی جانب سے کسی جارحیت کے امکان کا خطرہ بھی موجود ہے کیوں کہ CPEC پر کام ہو رہا ہے۔ باجوہ کے زمانے میں کام کیوں بند کیا گیا یہ اب راز نہیں ہے۔ سب کو پتا ہے کہ گوادر میں آئیل ریفائنری کام شروع کرے گی تو پاکستان تیل میں خودکفیل ہو سکتا ہے۔ ماہرین جو اس منصوبے پر کام کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ تیل کی قیمت کم ہو کر ستر اسی روپے تک آ سکتی ہے لیکن اس صورتِ حال کا تعلق صفائی سے ہے۔ شبر زیدی نے صاف صاف کہہ دیا کہ پاکستان کو مافیاز چلا رہے ہیں۔ انہوں نے مافیاز کی فہرست میں فوج کو بھی شامل کیا اور جنرل باجوہ کا براہِ راست نام لیا وہ کہتے ہیں کہ وزیراعظم بھی مافیاز کے سامنے بے بس ہے۔ ملک کے مقتدر حلقے فیصلہ کر رہے ہیں کہ مافیاز کا خاتمہ کر دیا جائے لیکن خاتمے کا یہ کام بہت سخت مشکل اور محنت طلب ہے اور یہ کام مافیا میں سے ہی کوئی کرے گا۔ جو فیصلہ کرے گا کہ ہم مافیا نہیں ہیں نہ اپنے اندر مافیا بننے دیں گے، نہ اپنے کسی آدمی کو معاف کریں گے۔ ایک بار مافیاؤں کو ختم کرنے کا فیصلہ، جو کہ بہت مشکل فیصلہ ہے، ہو جائے تو ملک کی مالی، معاشی، مادی صورت حال تو شاید تبدیل ہو جائے لیکن اس کی اخلاقی روحانی تبدیلی کا کوئی مشن، کوئی تصور، کوئی خیال، کسی ذہن، کسی گوشے اور کسی مافیا کے ذہن میں دور دور تک نہیں ہے کیونکہ ہمارا اصل مقصد، منزل ترقی یافتہ، تعلیم یافتہ پاکستان ہے

ہدایت یافتہ پاکستان نہیں۔ جب مقصد ترقی اور مادی ترقی ہے تو اسی میں ترقی ہوگی۔ جب ہدایت، اخلاقیات، روحانیت ہمارا مقصد، ہدف، منزل نہیں بلکہ ہر فرد کا ذاتی مسئلہ ہے تو جان لاک کے الفاظ میں ہم یہی کہیں گے کہ مجسٹریٹ کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کھینچ تان کر خدا کی طرف جنت کی طرف بلائے، یہ لوگوں کی آزادانہ مرضی ہے۔ وہ آزاد ہیں وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کدھر جانا چاہتے ہیں، جہنم کی طرف یا جنت کی طرف۔

ترکی کا اسلامی ماڈل

عالم اسلام میں اس وقت ترکی پر تمام اسلامی تحریکوں کی نظریں ہیں، ترکی کا ذکر ہے اس سے تعلقات ہیں، ترکی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے۔ ترکی ماڈل کو سنگین غلط فہمی کے سبب حقیقی اسلامی حکومت کا ماڈل سمجھا جا رہا ہے۔ ترکی کے آخری سو سال میں ترکی جمہوریت اور مغربیت کو اختیار کر چکا تھا نام خلافت کا تھا اصلاً یہ جمہوریہ تھا۔

اردگان جس سلطنتِ عثمانیہ کی بات کرتے ہیں وہ آخری زمانے کے تین جدید سلاطین کی سلطنت ہے جو پتلون کوٹ پہنتے تھے، جنہوں نے فرانس سے فوج کے لیے موسیقار بلوائے تھے اور فوج کا لباس تبدیل کرنے کے ساتھ ترکی امارت کو جدید ریاست میں تبدیل کر رہے تھے۔ یورپی یونین کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے اردگان کی کوششیں سامنے ہیں۔ خلافت دارالحرب کی رکنیت کے لیے بے چین کیوں تھی؟ صرف اس لیے کہ ترکی والوں کے مزے ہوتے وہ یورپ میں ہر قسم کی آمدورفت مفت میں رکھ سکتے تھے۔ کیا دارالاسلام، دارالحرب میں تحلیل ہوسکتا ہے؟

طالبان ماڈل اور قوانین کی تعلیم

طالبان سے بحیثیت مجموعی اسلامی تحریکیں، سیاسی، مذہبی، جماعتیں لاتعلق لا پروا ہیں ان کا ماڈل ترکی کے مقابلے میں کسی کو پسند نہیں آ رہا ہے کیونکہ ابھی تک یہ خالص اسلامی ماڈل ہے۔ عورتوں کے مسئلے پر طالبان ابھی تک شرعی موقف پر قائم ہیں جبکہ OIC اور جامعہ ازہر کے علماء کے گروہ طالبان کو قائل کرنے کے لیے آئے تھے کہ وہ مغرب کے مطالبات کو منظور کریں، عورتوں کی تعلیم بحال کریں کہ اسلام میں تعلیم کی بڑی اہمیت ہے۔ افغانی علماء نے

جامعہ از ہر کے علماء کو کتاب وسنت، اسلامی تاریخ اور اسلاف کے عمل سے ثابت کر دیا کہ عورت کو جدید تعلیم نہیں دی جاسکتی اور وہ قائل ہو گئے۔ دینی علمیت کی حاکمیت قائم ہو گئی۔

OIC اور از ہر کے علماء سے اگر مسلم عورتیں یہ سوال کریں کہ اسلام میں تعلیم کی بہت اہمیت ہے تو عورتوں کے تعلیمی ادارے اسلامی تاریخ میں کہاں تھے؟ کب تھے؟ اور کیوں نہیں تھے؟ عورتوں کو پندرہ سو سال تک تعلیم سے کیوں محروم رکھا گیا؟ اس ظلم کا ذمہ دار کون ہے؟ تو بے چارے شرما کر رہ جائیں گے۔ انھیں اپنی تاریخ پر شرم آئے گی حالانکہ ہماری تاریخ میں عورت کیا مردوں کے لیے بھی اسکول کالج یونیورسٹی کی تعلیم کا کوئی نظام اس طرح موجود نہیں تھا جس طرح مغرب نے ایجاد کیا ہے۔ روایتی تہذیبوں میں تعلیم، تربیت، علوم، فنون، ہنر مندی، کاری گری، فن کاری، مہارتوں کے طریقے دوسرے تھے وہ مغرب جیسے نہیں تھے کیونکہ ان تہذیبوں کی اقدار، روایات، ایمانیات، مابعد الطبیعات مغرب سے بالکل مختلف تھی۔ جدید تعلیم ایک صنعتی معاشرے کی ضرورت ہے جو معاشرے صنعتی نہیں ہوتے وہاں اس تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔

OIC اور از ہر کے علماء کا وہی مطالبہ تھا جو مغرب کا تھا کہ عورت مرد کو مساوی تعلیم اور نوکری کے مساوی مواقع مہیا کرو۔ از ہر کے علماء اور اسلامی تحریکوں کے رویے بتاتے ہیں کہ وہ عورت کے معاملے میں مغرب کی کسی نہ کسی حد تک تقلید کے شرعی طور پر قائل ہو چکے ہیں حالانکہ اس تقلید کے جو دلائل بیان کیے جا رہے ہیں وہ سادہ لوحی اور اسلامی تاریخ سے ناواقفیت کا شاہکار ہیں۔ عورت اور مرد کی تعلیم الگ الگ ہے، خاندان عورت چلاتی ہے لہٰذا وہ نوکری نہیں کر سکتی۔ یہ بنیادی مقدمات ہیں جن پر امت کا اجماع ہے۔ استثنائی صورت حال ہر جگہ رہتی ہے اور وہ رہے گی۔

پاکستان کی اسلامی تحریکیں

پاکستان کی اسلامی تحریکوں، مذہبی، سیاسی جماعتوں کو ابھی تک پاکستان سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ وہ کبھی پاکستان کو مدینہ ثانی سمجھتی ہیں، کبھی الٰہی ریاست اور کبھی سیکولر ریاست۔ مغرب کے بارے میں بھی وہ بہت سی خوش فہمیوں کا شکار ہیں۔ اسلامی مملکت، سیکولرازم اور پاکستان کی

اصل حقیقت جاننے کے لیے عزیز احمد کی ایک کتاب ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' کے آخری تین ابواب کا مطالعہ کریں۔ کتاب انگریزی میں بھی ہے۔

Islamic Modernism in Indo Pakistan

اس کے ساتھ جسٹس منیر انکوائیری کمیشن رپورٹ کے آخری تین ابواب پڑھ لیں یا ان کا خلاصہ عزیز احمد کی کتاب میں پڑھ لیں یہ اسلام، مغرب اور پاکستان کو سمجھنے کا سب سے آسان ترین طریقہ ہے جو ہم نے آپ کو بتادیا۔

وہ تحریکیں جو پاکستان میں انقلاب برپا کرنے کی دعوے دار ہیں وہ دعوے اور وعدے کرنے کی بجائے، خواب دیکھنے اور دکھانے کی بجائے تین کتابوں کا مطالعہ کرلیں جو انقلاب سے متعلق ہیں ان کتابوں کو پڑھ کر ہم نئ حکمت عملی بنا سکتے ہیں اور گزشتہ دوسو سال میں برپا ہونے والے انقلابِ روس، چین، امریکہ، فرانس اور ایران کے بارے میں بہت سی نئ باتیں جان سکتے ہیں۔ فرانسیسی مفکر فوکو یاما نے ایران جاکر انقلابِ ایران کا مشاہدہ کیا اور اس موضوع پر چند مضامین بھی لکھے ان کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

1. *A. Lieven, Pakistan: A Hard Country*

کے آخری ابواب

2. *The Pakistani Taliban*
3. *Defeating the Taliban*

TTP کے بارے میں کچھ پڑھتے ہوئے افغانستان کے طالبان سے ان کا تقابلی مطالعہ بھی کرتے جایئے، آپ کو خود معلوم ہوجائے گا کہ TTP کیوں کامیاب نہیں ہوسکتی اور طالبان کیوں کامیاب ہوگئے۔ TTP والے صرف ایک ملک کی فوج کو شکست نہیں دے سکے، افغانی طالبان نے دنیا کے تمام ممالک کی فوجوں، سائنس ٹکنالوجی، اسلحہ، طاقت، شوکت، حشمت کو عبرت ناک شکست دی اور منہ کے بل گرادیا۔

صدر بش نے افغانستان پر حملے سے پہلے ہی کہا تھا کہ طالبان سے ان کے مذاکرات نہیں ہوں گے، آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جنگ جاری رہے گی اور ہم افغانستان کے ہر تاریک غار میں جمہوریت کی شمع روشن کریں گے مگر اسی امریکہ اور اس کی حامی دنیا کے تمام

ملکوں نے بے شرمی سے شکست مانی، دہشت گرد کا خطاب واپس لے کر انھیں پر امن طالبان کہا اور ذلیل ہو کر افغانستان سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے جمہوریت کے چراغ بھی ساتھ لے گئے جو ہماری اسلامی تحریکوں کو بہت پسند ہے۔ جمہوریت کو ایک آلے، اوزار، ذریعے، ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا الگ بات ہے اور جمہوریت پر ایمان لانا، اسے خلافتِ راشدہ سے ثابت کرنا دوسرا ایمان ہے۔ جمہوریت کو صرف ایک حکمتِ عملی کے طور پر ضرور اختیار کیا جا سکتا ہے۔ آخر ہٹلر، اسٹالن، لنین نے بھی جمہوریت کو استعمال کر کے پھینک دیا۔

انقلاب پر دو اہم کتابوں کے نام بھی لکھے جا رہے ہیں جن کا مطالعہ مفید رہے گا۔

1.Theda Scokpal: *States and social revolution a comparative analysis of France, Russian and china.*

2.Theda Scokpal: *Social revolutions in the modern world.*

اکتوبر ۲۰۲۲ء سے لیکر اکتوبر ۲۰۲۳ء تک عمران خان کے بعد جو منظر نامہ سامنے آیا اس میں PDM کی تمام سیاسی جماعتوں کو اقتدار دیا گیا، صرف مذہبی جماعتیں اقتدار سے محروم رہیں JUI کو البتہ اقتدار میں شامل کیا گیا۔ ایک سال کا یہ موقع مذہبی سیاست کے ابھرنے اور نکھرنے کیلیے بہترین موقع تھا لیکن نامعلوم وجوہ کی بنیاد پر مذہبی جماعتوں نے اکٹھے ہو کر یا تنہا رہ کر بھی کوئی کارکردگی نہیں دکھائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوج نے بھی ہدایت کی ہے کہ بس کام سے کام رکھو۔ بجلی، گیس، پیٹرول کی قیمتوں میں اتنا اضافہ کیا گیا کہ لوگوں کی ٹوٹی ہوئی کمر مزید بار بار ٹوٹتی رہی، مذہبی جماعتوں نے کوئی منظم، مؤثر احتجاج تک نہیں کیا۔ جماعت اسلامی نے مہنگائی کے خلاف ۲ ستمبر ۲۰۲۳ء کو ہڑتال کی اپیل کی۔ دن ہفتہ کا تھا۔ ہفتے کو ملک بھر میں عام تعطیل ہوتی ہے۔ تعطیل کے دن میں ہڑتال کی اپیل کا مطلب اپنا اندرونی خوف تھا۔ معلوم نہیں ہڑتال کامیاب ہوئی یا نہیں۔ لوگ بے چین ہیں، قیادت تلاش کر رہے ہیں قیادت مل نہیں رہی۔ ان حالات میں ویسے بھی مذہبی جماعتوں کو بھرپور سیاست کرنے کے باوجود اقتدار میں آنے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ جس ملک کی حالت یہ ہو کہ سالانہ 589 ارب روپے کی بجلی چوری ہوتی ہو (جنگ ۷ ستمبر ۲۰۲۳ء) بجلی کی ترسیل، تقسیم کے نقصانات 520 ارب روپے ہوں (جنگ کراچی ۲۸/اگست ۲۰۲۳ء)۔

90 کی دہائی میں PPI سے خوفناک معاہدے کیے گئے۔ یہ دعویٰ ہے وزیر اعظم انوار الحق کاکڑ کا (جنگ کراچی یکم ستمبر 2023)۔ان حالات میں مذہبی جماعتیں اقتدار لے کر کیا کر سکتی ہیں؟ سب سے زیادہ بجلی استری میں استعمال ہوتی ہے۔کیا استری کے بغیر کپڑے نہیں پہنے جا سکتے؟ سادہ سا سوال ہے۔سادہ لوح عوام کے لیے حالات یہی رہے تو لوگ استری نہیں کر سکیں گے کہ سب سے زیادہ بجلی استری ہی کھاتی ہے۔ چھ لاکھ فوج کی روزانہ استری پر قوم کے کتنے روپے خرچ ہوتے ہیں یہ بھی ایک سوال ہے؟ کیا ہم استری کی ثقافت عارضی طور پر ترک کر سکتے ہیں؟ اگر ترک کر دیں تو کیا حرج ہے؟

۱۹۷۷ء کی بھٹو ہٹاؤ تحریک کو اچانک تحریک نظام مصطفیٰ کا نام دے دیا گیا۔ یہ بہت بڑا کھیل تھا جس میں فوج شریک تھی۔تحریک کو اس نام نے بہت بڑی قوت مہیا کی۔PNA نے اعلان کیا کہ وہ تمام اشیاء کی قیمتوں کو ۱۹۷۰ء کی قیمت تک لے آئیں گے۔ یہ صرف نعرہ تھا کوئی حقیقت نہیں تھی۔سوال یہ ہے کہ مذہبی سیاسی جماعتیں ملک کے موجودہ حالات میں اشیاء کی قیمت کم کرنے کا کوئی پروگرام رکھتی ہیں؟ کیا ان کی کوئی تیاری ہے؟ بہت سی مذہبی جماعتوں کو تو ملک کے معاشی حالات کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ صرف نعرہ بازی میں مصروف ہیں۔معاشی حقائق بہت تلخ ہیں۔غریب کی معیشت کو درست کرنے کے لیے انقلابی جماعت اور انقلابی شخصیت کی ضرورت ہے۔گورنر ہاؤس کے سامنے پُرامن دھرنوں کا کچھ حاصل نہیں۔ جمہوری عمل اور عوام پر ریاست کا تشدد اس پرامن جمہوری جدوجہد سے بہت مضبوط ہوتا ہے۔ ساری زندگی آپ پُرامن جلوس نکالتے رہیں ریاست آپ سے کبھی ناراض نہ ہوگی۔

جمہوری ریاست میں تنقید اور احتجاج جلسے جلوس کی آزادی اسی لیے ہوتی ہے کہ ہر شخص خوش ہوتا رہے کہ وہ کچھ کر رہا ہے یعنی کیتلی سے ڈھکن ہٹا دیا جاتا ہے کہ پانی ابل کر باہر نہ آئے، اندر ہی رہے۔

۲۸ جولائی ۲۰۲۳ء کو FBR کے سابق چیئرمین شبر زیدی نے جو انٹرویو دیا وہ مذہبی جماعتوں کے لیے چشم کشا ہونا چاہیے انٹرویو نے بتا دیا کہ ملک کو مافیاز چلا رہے ہیں۔انہوں نے فوج کو بھی مافیا قرار دیا۔تو کیا ان حالات میں انقلابی قیادت کے بغیر تبدیلی آسکتی ہے؟

یوٹیوبرز کو کروڑوں روپے دے کر انتخابی مہم چلانے سے کیا اقتدار مل سکتا ہے؟ مل جائے تو کیا چل سکتا ہے؟ شبر زیدی نے کہا PTI حکومت چلتی رہتی تو معاشی تباہی ہوتی۔ تمباکو مافیا، ملز اور زمینداروں پر ہاتھ ڈالا تو PTI کی قیادت بچانے آ گئی۔ حکومتوں کو مافیاز چلاتے ہیں۔ عمران خان نے کہا کہ تم جو کر سکتے ہو کرو، مَیں فضل الرحمان کے دھرنے سے خوفزدہ ہوں۔ مَیں اس بات پر قائل ہو چکا ہوں کہ مافیاز حکومتوں کو چلاتے ہیں۔ ہماری کوئی حکومت اتنی طاقت ور نہیں ہوتی کہ شٹر پاور سے لڑ سکے، بس شٹر ڈاؤن شروع ہو جاتا ہے۔ (جنگ کراچی ۹ جولائی ۲۰۲۳ء)

مذہبی سیاست اس انٹرویو کو غور سے پڑھے اور پھر اپنی طاقت، قوت، حکمت، صلاحیت کا جائزہ لے کہ کیا وہ مافیاز سے لڑ سکتی ہے؟ ان کو سیدھا کر سکتی ہے؟ شبر زیدی بتاتے ہیں کوئی سیاسی حکومت زرعی انکم ٹیکس میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ زمینداروں کو نوٹس بھیجا تو شاہ محمود قریشی PTI کے نائب صدر اور وزیرِ خارجہ آ گئے۔ اگر آپ شٹر پاور سے لڑنے پر تیار نہیں تو ٹیکس نظام ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ ریٹیلرز مافیا ہیں۔ یہ بازار بند کر دیتے ہیں۔

ریٹیلرز اور آڑھتی کا ٹیکس نہ ہونے کے برابر ہے۔ کراچی کے ٹریڈرز کہہ رہے ہیں ہم ٹیکس نہیں دیں گے۔ ۲۰۲۲ء میں تنخواہ دار طبقے نے 264 ارب Tax دیا ایکسپورٹرز اور ریٹیلرز نے صرف نوے ارب کا ٹیکس دیا جو تنخواہ دار طبقے سے 1175 ارب روپے کم ہے۔

ریٹیلر سیکٹر کا ملکی معیشت میں 19 فی صد حصہ ہے اور یہ صرف کل ٹیکس کا 0.4 فیصد ٹیکس دیتے ہیں۔ زراعت کا معیشت میں حصہ 22 فی صد سے زیادہ ہے جبکہ یہ صرف 4 ارب ٹیکس دیتے ہیں۔ آڑھتی اور ریٹیلرز مل کر چالیس فی صد معیشت کا حصہ ہیں اور یہ چالیس فی صد حصہ ٹیکس نہیں دیتا یا بہت کم شٹر پاور سے لڑے بغیر معیشت، ٹیکس ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ کراچی کا لیاقت بازار جتنا ٹیکس دیتا ہے اس کا ٹیکس پورے لاہور کے ٹیکس سے زیادہ ہے۔ آپ لاہور سے آگے جاتے جائیں دوکاندار کم سے کم ٹیکس دیں گے بلکہ نہیں دیں گے۔

پشاور دس روپے لاہور بیس اور کراچی 50 روپے ٹیکس دیتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ اتنا فرق ہے ساؤتھ اور نارتھ میں۔ کوئی مٹھائی والا، ریسٹورنٹ والا، گوشت والا، دودھ والا ٹیکس نہیں دیتا۔ کیا مذہبی سیاسی جماعتیں ان سے نمٹ سکتی ہیں؟

سندھ میں تو ایگری کلچر انکم ٹیکس کا ڈپارٹمنٹ ہی نہیں ہے تو ٹیکس کون جمع کرے گا؟

پنجاب میں بھی زرعی انکم ٹیکس کے ڈپارٹمنٹ کا یہی حال ہے بورڈ آف ریونیو والے زرعی ٹیکس جمع کرتے ہیں، انہیں الف ب بھی نہیں آتی۔

نصر اللہ دریشک نے کہا نوے سال کے سیاستدان نے مجھ سے کہا: بیٹا یہ تیرے بس کا کام نہیں ہے، اس کو چھوڑ دے، اس کو رہنے دے۔ ہم ساؤتھ پنجاب کے MNA ہیں، ہمارے بغیر کوئی گورنمنٹ نہیں چل سکتی۔ بیٹا ’تُو ابھی ینگ ہے‘ بچہ ہے، تُو اس کو چھوڑ دے۔ یہ تیرے بس کا کام نہیں۔

میں نے پراپرٹی کی ویلیو پر ٹیکس کو دس سے بیس کر دیا۔ DHA کے سارے آفس خالی کر گئے۔ سارا دھندہ بند ہو گیا۔ جنرل باجوہ نے مجھے بلایا: سر یہ کیا ہوا ہے؟ میں نے کہا: سر مَیں نے یہ کیا ہے کہ میں نے اس ٹیکس کو سو فیصد کر دیا ہے۔ تو کہنے لگے یار مجھے بار بار DHA والے فون کرتے ہیں کہ شبر صاحب نے کوئی عجیب سی چیز کر دی ہے۔ دن میں ایک سودا بھی نہیں ہوا ورنہ روزانہ دو سو سودے آتے تھے۔ ساری دوکانیں بند ہو گئیں۔ مَیں نے کہا سر پھر کیا کریں؟ یار اس کو تھوڑا آگے پیچھے کر دو۔ ہمارا تو دیکھیں سارے لوگ DHA کے پلاٹ خریدتے ہیں، بیچتے ہیں۔ تو اب کیا کرنا ہے؟ مَیں نے اسمگلنگ میں کوئٹہ پر ہاتھ ڈالا تو میرے پاس ساؤدرن کمانڈ کے کمانڈر آئے۔ انہوں نے کہا: اس کو ذرا آہستہ کریں کیونکہ سیاسی افراتفری ہو جاتی ہے۔ آپ اسمگلنگ زیادہ روکنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس علاقے میں لوگوں کے پاس روزگار نہیں ہے۔ Try to understand these things

(جنگ کراچی، ۲۹ رجولائی ۲۰۲۳ء)

ساؤدرن کمانڈ کی بات اہم ہے۔ سو سال سے کوئٹہ سے لے کر کراچی تک اسمگلنگ کا کام ہوتا رہا ہے اور لاکھوں لوگوں کا کاروبار اس سے وابستہ ہو چکا، انہیں متبادل روزگار دیے بغیر ختم کر دیں تو لاکھوں لوگ بھوکے مریں گے۔ مسئلہ ہے لیکن اس کا سادہ حل یہ نہیں ہے کہ بند کر دو Rule of Law کو مسئلے کا حل یہ نہیں بلکہ بہت سے سخت فیصلے کرنے ہوں گے۔ دین کو ایک زندہ متحرک قوت بنانا ہوگا۔ ایک مذہبی انسان تیار کرنا ہوگا۔ یہ کام پاکستانی ریاست

نہیں کرسکی نہ کرے گی نہ، اس کا یہ مقصد ہے۔ ریاست ساورن ہوتی ہے۔ خدا اور شریعت بھی اس کے تابع ہوتے ہیں لہٰذا پاکستان میں اسلامی اقتدار کے لیے انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ کیا ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں نے اس بارے میں کچھ کام کیا ہے؟

مذہبی سیاست کا عجیب معاملہ ہے۔ وہ فوج کی تاریخی حلیف بھی ہے اور فطری حلیف بھی ہے۔ اسی لیے پاکستان کو ایک اسلامی ریاست تسلیم کرنے کے باوجود مذہبی جماعتوں نے زکوۃ کو بیت المال ریاست کا حق قرار نہیں دیا۔ زکوۃ مذہبی جماعتیں ہی وصول کرتی ہیں ریاست نہیں۔ یہی نکتہ بتاتا ہے کہ مذہبی قوتیں ریاست پاکستان کو مشکوک بھی سمجھتی ہیں مگر اسلام کا محافظ بھی کہتی ہیں۔ فوج کتنی ہی طاقت ور ہو، وہ اسلام اور اسلامی قوتوں سے زیادہ طاقتور نہیں ہوسکتی۔ ایوب خان نے جماعت اسلامی کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی، پرویزی اسلام کو ریاستی سرپرستی ملی لیکن وہ جماعتِ اسلامی کو ختم نہ کرسکے۔ فوج طاقتور ترین عنصر ہے لیکن وہ خدا نہیں ہے۔ پرویز مشرف نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو برطرف کردیا مگر بعد میں وہ بڑی شان وشوکت سے بحال ہوئے، فوج ان کی بحالی کی راہ میں حائل نہ ہوسکی۔ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کو جنرل فیض حمید اور باجوہ نے سپریم کورٹ سے برطرف کرانے کی پوری کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ فوج نے الطاف حسین کو زندہ کیا، اسے ہیرو بنایا، عمران خان کو زندگی دی، اسے ملک کا سب سے مقبول لیڈر بنادیا مگر فوج دونوں لیڈروں کو ختم نہیں کرسکی۔ فوج نے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن یہ کوشش بھی ناکام ہوئی، پیپلز پارٹی کو فوج سیاست اور ریاست سے نہیں نکال سکی، لہٰذا مذہبی سیاست میں فوج سے خوف کے جو رویے دیکھے جاتے ہیں وہ بے جا ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

فیض آباد دھرنا پر قاضی عیسیٰ فائز نے فیصلہ دیا کہ فوج اس معاملے میں کیسے شریک ہے؟ یہ سیاسی معاملہ ہے جو حکومت کو طے کرنا چاہیے۔ جنرل فیض حمید TLP سے تحریری معاہدہ کس بنیاد پر کررہے ہیں؟ انہیں ضمانت کس بنیاد پر دے رہے ہیں؟ سیاست میں ملوث فوجی اہلکاروں کے خلاف ریاست کاروائی کرے لیکن کاروائی نہ ہوئی۔ ان کے فیصلے کے خلاف PTI, MQM, الیکشن کمیشن، ریاستی خفیہ ادارے، صدرِ مملکت سب نے اپنا اپنا کام کیا۔ ریفرنس دائر ہوا نظر ثانی کی اپیلیں دائر کی گئیں، اب اتفاقاً فائز عیسیٰ خود چیف جسٹس ہیں

اور مقدمہ چلنے کے لیے آیا تو مقدمہ دائر کرنے والے مقدمہ واپس لینے کی درخواستیں دائر کر رہے ہیں۔ چیف جسٹس پوچھ رہے ہیں کہ کس کا ڈر ہے؟ کس کے کہنے پر مقدمہ دائر کیا تھا؟ اب پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو؟ جو فیصلہ تھا وہ درست تھا۔ عمران خان کے معاملے نے بتا دیا کہ فوج کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے تھا۔ عمران خان نے اقتدار سے نکلنے کے بعد فوج کے خلاف جو زہر اُگلا اس کا اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ ایک سال تک فوج کی عزت افزائی ہوتی رہی، فوج کچھ نہ کر سکی۔ اس زمین پر صرف فوج نہیں ہے اللہ کی حکمرانی قائم ہے۔ ہمیں اس حکمرانی کا خوف کرنا چاہیے نہ کہ فوج سے خوفزدہ ہو کر اپنی پالیسیاں تبدیل کر لینی چاہئیں۔ فوج نے کرونا میں کہہ دیا مسجدیں بند کر دو تو آپ نے مسجدیں بند کر دیں، آپ کہتے: ہم یہ نہیں کر سکتے، یہ اجماعِ اُمت کے خلاف ہے، یہ اجماع صحابہ کے خلاف ہے۔ صحابہ کا وبا میں اجماع منعقد ہو چکا کہ Social Distancing نہیں ہوگی۔ مساجد کھلی رہیں گی۔ طاعون کا مریض بھی مسجد آ سکتا ہے۔ علماء ریاست سے صرف یہ کہتے کہ ریاست خود مساجد بند کر دے، عوام متبادل نظام تخلیق کر لیں گے تو ریاست کا اصل چہرہ بے نقاب ہو جاتا۔ آپ نے معاہدہ کر کے اس چہرے کو چھپا دیا۔ عمران دورِ حکومت میں TLP کے خلاف لاہور میں آپریشن ہوا۔ رمضان کے مہینے میں اندازاً ۲۰ سے ۴۰ کارکن شہید ہوئے۔ TLP نے اسلام آباد لانگ مارچ کا اعلان کیا قافلہ درمیان میں تھا حکومت اور TLP میں مذاکرات کا دروازہ بند تھا۔ مسئلہ وسطی پنجاب تک پہنچ رہا تھا وہاں سے اکثریت سپاہی کے طور پر بھرتی ہوتے ہیں۔ جنرل باجوہ نے عقیل کریم ڈھیڈی کے گھر پر مفتی منیب الرحمٰن کو طلب کیا۔ خفیہ معاہدہ ہوا، معاہدہ کے ضامن جنرل باجوہ تھے۔ معاہدہ مفتی منیب اور جنرل باجوہ کے علم میں ہے، عمران خان کو بھی نہیں بتایا گیا کہ معاہدہ میں کیا طے پایا۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا معاہدہ تھا جس میں ریاست، حکومت غائب تھی، اصل حکمران باجوہ صاحب تھے۔ ستر سال سے فوج ہی اصل حکمران ہے لیکن معاہدہ کا نتیجہ، اثر، تتمہ یہ تھا کہ TLP کو حکم دیا گیا کہ اب صرف جمہوری سیاسی عمل میں حصہ لو اور لانگ مارچ دھرنوں سے دستبردار ہو جا۔ مذہبی سیاسی قوت اس قدر طاقت رکھتی ہے کہ آرمی چیف کو درمیان میں آنا پڑتا ہے۔ سول حکومت کو مکھی کی طرح باہر نکال کر پھینک دیا گیا لیکن مذہبی طاقتوں کو اپنی قوتوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔

دینی جماعتیں سسٹم کے اندر رہ کر کام کر رہی ہیں

2024ء کے انتخابات میں بھی کسی جماعت کو اکثریت حاصل نہیں ہوئی اور نہ کوئی جماعت قومی جماعت کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ جماعت اسلامی کو شکوہ ہے کہ اس کی تمام سیٹوں پر دھاندلی کی گئی تا کہ اسے پارلیمنٹ سے باہر رکھا جا سکے۔ پاکستان کی دو اہم جماعتوں PTI,JUI عمران خان اور مولانا فضل الرحمان کا بھی یہ موقف ہے کہ 8 فروری 2024ء کا الیکشن شفاف نہیں تھا۔ الیکشن چوری کیا گیا، دونوں جماعتیں ملک گیر احتجاج کر رہی ہیں۔ مولانا نے کہا پورا الیکشن چوری ہوا ہے۔ 2018ء میں بھی دھاندلی ہوئی تھی۔ انتخابات کو JUI مسترد کرتی ہے (جنگ کراچی 16 فروری 2024ء) فضل الرحمان صاحب نے غصے میں یہ بھی فرمایا کہ عمران خان کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد فوج کے جنرل باجوہ اور فیض حمید کے کہنے پر پیش کی گئی۔ فوج نے PDM کو اپنے گھر بلایا اور مولانا فضل الرحمان کی شہادت کے مطابق میرے سامنے فوج نے ہدایات دیں کہ آپ نے ایسا اور ایسا کرنا ہے (جنگ کراچی 16 فروری 2024ء صفحہ 4)۔ یہ کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔ پوری دنیا کو معلوم ہے کہ عمران خان کو فوج اور سپریم کورٹ کی طاقت کے ذریعے برطرف کیا گیا۔ رات بارہ بجے سپریم کورٹ کھولی جا رہی تھی آخر کیوں؟ کسی غریب کی فریاد سننے کے لیے تو سپریم کورٹ کبھی نہیں کھولی گئی۔

سوال یہ ہے کہ مولانا کیا کر رہے تھے؟ وہ اس غیر جمہوری عمل میں کیوں شریک تھے؟ وہ تو جمہوری اقدار کی پاسداری کے سب سے بڑے پاسبان ہیں۔ PDM کے سربراہ کی حیثیت سے وہ فوج کی دعوت مسترد کر دیتے، PDM سے مستعفی ہو جاتے تب ان کی بات اور شخصیت میں وزن پیدا ہوتا صرف یہ کہہ دینا کہ میں تحریک عدم اعتماد کے خلاف تھا لیکن اپنے دوستوں کی وحدت کے لئے اپنے موقف اور رائے کی قربانی دی (جنگ کراچی 16 فروری 2024ء ص 4)۔ ہمیں حیرت ہے کہ مولانا جمہوریت کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ پاکستان میں غلبۂ جمہوریت ان کا دین اور ایمان ہے۔ جمہوریت کے تحفظ کے لئے PDM کی سربراہی انہوں نے قبول کی مگر اپنے دوستوں کے اتحاد کی خاطر PDM کے لیے انہوں نے جمہوریت کے گلے پر چھری چلانے کی اجازت فوج کو دے دی۔ آج وہ کس سے شکوہ کر رہے ہیں اور کس چیز

کا؟ جس جمہوریت کو مذہبی سیاست نے حکمت عملی کی بجائے اصول اور ایمان کا درجہ دے دیا ہے کم از کم اس جمہوریت کو مخالفت میں قربان تو نہ کرتے جنرل فیض حمید نے مولانا سے کہا جو کرنا ہے سسٹم کے اندر رہ کر کریں (جنگ کراچی 16 فروری 2024ء صفحہ اول) فیض حمید نے بہت اہم بات کی ہے اور اس پر مذہبی جماعتوں کو بے حد غور وفکر کرنا چاہیے سسٹم کے اندر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ جدید ریاست، جدید قومی ریاست جو مغرب کی ایجاد ہے اس کے سسٹم کے خلاف نہیں چلنا، اس کے سسٹم سے باہر نہیں جانا، اس کے سسٹم کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ کرنا چاہتے ہو سسٹم کی پیروی کرتے ہوئے کرو سسٹم ایسا زبردست ہے کہ وہ تم کو لمحوں میں خود تبدیل کردے گا۔ اس کی مثال جماعت اسلامی ہے۔ 1951ء کے صوبائی انتخابات پنجاب میں جماعت نے پہلی مرتبہ حصہ لیا سسٹم کے اندر جانے کے بعد اور انتخابی سیاست کو ایک اصول، خیر، حق سمجھنے کے نتیجے میں جماعت اسلامی جس انتخابی سیاست کے عمل سے گزری اس نے جماعت اسلامی کو قدم قدم پر تبدیل کیا یا جماعت کے تقویٰ، صالحیت اور صلاحیت سے سسٹم تبدیل ہوا؟ حافظ نعیم الرحمن نے 2023ء سے 2024ء تک جس قسم کی انتخابی سیاست کراچی میں کی، جو گُل کھلائے، جو کارکردگی دکھائی، اس سے ہر شخص کو معلوم ہوگیا کہ جو لوگ سسٹم بدلنے گئے تھے سسٹم نے خود ان کی اخلاقیات، نظریات، مقاصد کو تبدیل کردیا۔ ان کی سیاست اور دیگر سیاسی جماعتوں کی سیاست میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

سسٹم اتنا طاقت ور تھا کہ اس نے حافظ نعیم الرحمن سے کہلوایا کہ ہم دیوبندی بریلوی اسلام کو نہیں ماڈریٹ اسلام کو مانتے ہیں۔

جنرل فیض حمید کا بیان کہ "جو کرنا ہے سسٹم کے اندر رہ کر کریں" اس کو وسعت دی جائے تو یہ آوازیں بھی آپ نے بہت سے فوجی جنرلوں کی گزشتہ سالوں میں سنی ہوں گی۔ مشرف، کیانی، باجوہ سب دینی مدارس سے یہی کہتے تھے "قومی دھارے میں شامل ہوجائیں" یعنی سسٹم کا حصہ بن جائیں۔ دینی مدارس ابھی تک قومی دھارے، سسٹم میں شامل نہیں ہوسکے۔ وہ کچھ الگ سے لگتے ہیں لہذا ریاست کو مولوی، مدرسے، مذہبی جماعتیں اچھی نہیں لگتیں۔ جنرل باجوہ نے تو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا کہ دینی مدارس صرف مولوی اور دہشت گرد پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ تمھارا وجود بے کار ہے، تم کسی کام کے نہیں ہو۔ تمھارے علم کی کوئی Exchange Value نہیں ہے۔ تمھارا علم نہ

Export ہوسکتا ہے نہ اس سے زرمبادلہ Foreign Exchange کمایا جاسکتا ہے لہٰذا تمھارا علم علم ہی نہیں ہے۔ علم وہ ہوتا ہے جس کی Exchange Value ہوتی ہے، جو Export اور Import ہوتا ہے جس سے پیسہ (Capital) پیدا ہوتا ہے، کمایا جاسکتا ہے، تمھارا علم کس کام کا ہے؟ لیکن ریاست کمزور ہے لہٰذا وہ مدراس بند نہیں کرسکتی دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کے تین پڑوسی افغانستان ایران بھارت اس کے ازلی مخالف ہیں لہٰذا ترکی کی طرح پاکستان کے دینی مدارس کو ختم نہیں کیا جاسکتا یہ ریاست کی ضرورت بھی ہیں اسی لئے ریاست اسلام کو استعمال بھی کرتی ہے کہ بھارت سے تحفظ جہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ روح جہاد دینی مدارس کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی کیوں کہ لبرل تو بھارت کے حامی ہیں وہ پاکستان کا دفاع کرنے نہیں آئیں گے۔ مولوی، مذہبی جماعتیں ہی پاکستان کو مدینہ سمجھ کر جہاد کے لئے نکلیں گی لہذا روح جہاد جو سیاسی ریاستی دفاعی مجبوری ہے اس کو زندہ رکھنے کے لئے مدارس کا وجود بھی ضروری ہے علماء کو شکر کرنا چاہیے کہ پاکستان اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے ان کے خلاف کمال اتاترک کی طرح کاروائی نہیں کرسکتا۔ جنرل فیض حمید نے سسٹم کی بات کی ہے تو یہ اس سسٹم کو چلانے والے تمام سیاست دان اور تمام فوجی حکمران مشترکہ طور پر دینی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم کو Brain Washing کہتے ہیں اور سیکولر تعلیمی اداروں کی تعلیم کو Education کہتے ہیں حالانکہ یہ خود Brain Washing ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان اداروں سے نکلنے والی نسل اپنے بچوں کو ڈے کیئر سنٹر میں پھینک کر عورت مرد دونوں نوکری پر جاتے ہیں۔ جواب میں بچہ جوان ہوتے ہی بوڑھے ماں باپ کو اولڈ ہوم میں پھینک دیتا ہے۔ اور مولانا طارق جمیل ہمیں آ کر بتاتے ہیں کہ مغرب والوں کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ یہ کون سے اخلاق ہیں کہ اولاد بوڑھے ماں باپ کو اولڈ ہوم میں ڈال دے؟ مولانا طارق جمیل اور دیگر علمائے کرام کبھی مغرب کے اولڈ ہوم کا بھی دورہ کرلیں تاکہ وہ ہمیں آ کر مغرب کی اخلاقیات کو مثالی بنا کر پیش نہ کریں۔

سسٹم آپ کو بدل دیتا ہے

سسٹم کی طاقت کیا ہے؟ سسٹم کیسے کام کرتا ہے؟ سسٹم کس طرح دین کو، اجتہاد کو، دینی علمیت کو مولوی کو تبدیل کرتا ہے، اس کی چند مثالیں ہم پیش کرتے ہیں۔ ہم ایک محدث سے واقف ہیں جو پانچ زبانوں میں شاعری کرتے ہیں، جس میں انگریزی بھی شامل ہے۔ وہ دینی

علوم میں محققانہ بصیرت رکھتے ہیں وہ Ph.D بھی ہیں لیکن ان کی تنخواہ 25 ہزار روپے ہے۔ یہ سسٹم کا جبر ہے کیوں کہ سسٹم، نظام حکومت ریاست دینی علمیت کی سرپرستی نہیں کرتی لہذا اس سسٹم سے باہر مدرسے کے محدث کو یہی تنخواہ ملے گی۔ یہ بھی ریاست نہیں عوام مہیا کرتے ہیں لیکن یہی محدث اگر کسی یونیورسٹی چلے جائیں تو انھیں گریڈ 20 ملے گا اور تین لاکھ روپے تنخواہ ملے گی۔ اگر یہ کسی اسلامی بینک کے مشیر بن جائیں تو ان کو گاڑی بھی ملے گی اور چار لاکھ روپے تنخواہ میں بھی ملیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ایک ہی جسم ایک ہی علم والی ہستی کا مقام جگہ، مرتبہ، Status بدلنے سے کیوں بدل جاتا ہے؟ جواب جنرل فیض حمید کا جملہ ہے۔ تم سسٹم کا حصہ نہیں بنے لہذا سسٹم تمھیں سزا دے گا، تمھیں بھوکا مارے گا، تمھاری سرپرستی نہیں کرے گا۔ کیوں کہ سسٹم تمھارے سسٹم کو سسٹم نہیں سمجھتا، تمھارے علم کو علم نہیں سمجھتا لہذا تمھاری سرپرستی نہیں کرتا۔

اسلامی امارت کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں بادشاہ بڑے عالم دین کو اپنے برابر بٹھاتا تھا، وہ سسٹم عالم کو یہ عزت دیتا تھا۔ علماء کو وظیفے، جاگیریں، ہدایہ، عطیات دئے جاتے تھے۔ کیا پاکستان کا سسٹم علماء کے ساتھ یہی رویہ رکھتا ہے؟ اگر نہیں تو یہ ریاست مدینہ کیسے ہوگئی؟ جب جنرل فیض حمید کہتے ہیں کہ "جو کرنا ہے سسٹم کے اندر رہ کر کرو" تو اس کا عملی تجربہ ہم بتاتے ہیں۔ دینی مدارس سے فارغ التحصیل بعض علماء جب PhD کر کے یونیورسٹی ملازمت میں آ جاتے ہیں تو سب سے پہلے خود بخود ان کی ٹوپی اتر جاتی ہے، پھر شلوار کرتا بھی اتر جاتا ہے، پھر داڑھی بھی چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اور نماز کے معاملے میں اس سسٹم والے کیسے ہوتے ہیں؟ اس کے لئے کراچی یونیورسٹی کی اسلامک سٹڈیز فیکلٹی کو دیکھ لیا جائے اور وہاں کے اساتذہ کو۔ فیکلٹی کے بالکل سامنے مسجد ہے لیکن ایک دو اساتذہ کے سوا کوئی استاد اذان کی آواز سن کر اپنا دفتر کا کام بند کر کے مسجد کی طرف نہیں جاتا۔ سسٹم نے مولوی کو تبدیل کر دیا۔ اسی لئے کہا جا رہا ہے کہ سسٹم کے اندر رہ کر کام کرو بڑے علماء اور ہمارے مولانا فضل الرحمان صاحب جب اس سسٹم کے اندر یا اس کے اداروں کے اندر کچھ دیر کے لئے جاتے ہیں تو ان کے اندر کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے؟ یہ کہ وہ حرام موسیقی پر گائے گئے قومی ترانے کے احترام میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حرام کا احترام، سسٹم کا احترام، سسٹم آپ کو خود سکھا دیتا ہے۔ ایوانِ صدر اور وزیر اعظم ہاؤس میں ہمارے ایک اہلِ حدیث عالم دوست کو قومی تقریبات میں مدعو کیا گیا۔ وہاں وہ قومی ترانے پر کھڑے ہو گئے جو حرام موسیقی پر گایا گیا۔ واپسی پر ہم نے ان سے پوچھا کہ صلوۃ

وسلام پر کھڑا ہونا تو شرک ہے لیکن حرام موسیقی کے احترام میں کھڑا ہونا تو شرک اکبر ہے آپ بیٹھے کیوں نہیں رہے؟ یہ سسٹم کی طاقت ہے سسٹم نے آپ کو بدل دیا حتیٰ کہ شرک کی تعریف بھی بدل دی۔ آپ غور کریں تو آپ کو بے شمار مثالیں مل جائیں گی سسٹم اتنا طاقتور ہے کہ وہ آپ کے دماغ درست کر دیتا ہے اور آپ کو سیکولر بنا دیتا ہے۔ پاکستان کا آئین جو سسٹم کا حصہ ہے اس کی کئی شقیں جو باب اول میں Human Right Charter سے لی گئی ہیں اور اسلام کے صریحاً خلاف ہیں، علماء کے بھی علم میں ہیں لیکن علماء اس آئین سے وفاداری کا حلف اٹھاتے ہیں۔ جب ہم جنگ اخبار میں کام کرتے تھے اور مولانا سمیع الحق سینیٹر تھے اور ہمارے نہایت مہربان و مشفق بزرگ اور دوست بھی تھے ان سے ہم نے یہ سوال کیا کہ مولانا آپ ایک ایسے آئین کا حلف کیوں اٹھاتے ہیں جس کی شقیں دین حق کے خلاف ہیں۔ تو ہنسنے لگے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے حیدر آباد میں ایک تقریر کی کہ پاکستان میں تبدیلی ووٹ سے نہیں آئے گی، اس کے لئے ہمیں پہاڑوں میں جانا پڑے گا۔ ایک بار لاہور کے جلسے میں مولانا نے کلاشنکوف پکڑ کر تقریر کی۔ ہم نے کراچی آمد پر پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ مولانا کا جواب تھا: اس سسٹم کو بدلنا ہوگا، اس کے اندر کچھ نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم نے کہا ہم چلنے کے لئے تیار ہیں لیکن پہلے آپ اپنے منصوبے کا Blue Print تو پیش کریں صرف زبانی کلامی انقلابی اقدامات نہیں ہو سکتے۔ کیا ہم اس سسٹم کو بدلنا چاہتے ہیں یا اس کے اندر ہی رہنا چاہتے ہیں اور اس کی اصلاح ہی ہمارا مقصدِ زندگی ہے؟ سسٹم کی طاقت دیکھیے کہ ہزاروں میل دور فلسطین میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے تو پاکستان کی مذہبی جماعتیں، سیاسی مذہبی تحریکیں زبردست احتجاج کر رہی ہیں۔ کشمیر میں ظلم پر احتجاج ہو رہا ہے لیکن پڑوسی ملک چین میں دنیا کی سب سے بڑی جیل مسلمانوں کے لیے بنائی گئی ہے، 10 لاکھ مسلمان مرد عورت بچوں کو یہاں بند کر کے سیکولر تعلیم دی جا رہی ہے، دین سے برگشتہ کیا جا رہا ہے لیکن مولانا فضل الرحمن نے اس کے خلاف کبھی کوئی بیان دیا؟ مذہبی سیاسی اسلامی جماعتوں نے کبھی کوئی احتجاج کیا؟ نہیں! اس لیے کہ سسٹم اجازت نہیں دے رہا اس لیے کہ چین سے سسٹم کو فائدہ ہے۔ CPEC سے معاشی فائدے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تمام معاشی فائدے سودی معاہدوں کے ذریعے پہنچیں گے لیکن مولانا فضل الرحمن فخر سے بتاتے ہیں کہ سی پیک ہماری حکومت کا کارنامہ ہے، یہ ہم نے انجام دیا ہے۔ یہ آواز مولانا کی آواز نہیں ہے یہ سسٹم کی

آواز ہے۔ سسٹم نے سامری کا بچھڑا قوم پرستی کی صورت میں بنا دیا ہے۔ اس قوم پرستی کو مذہبی قوم پرستی کا رنگ بھی دے دیا گیا ہے۔ بچھڑا وہی آواز نکالتا ہے جو آواز اسے عطا کی گئی ہے۔ سعودی عرب میں اسلام کے خلاف کیا کچھ ہو رہا ہے لیکن کیا آج تک پاکستان یا دنیا کی کسی تحریک یا مذہبی سیاسی جماعت نے احتجاج کیا، جلوس نکالا تنقیدی بیان دیا؟ نہیں! اس لیے کہ سسٹم کے مفاد میں نہیں سسٹم کے چین سے، سعودی عرب سے اچھے معاشی تعلقات ہیں لہذا ان تعلقات کی قیمت سسٹم ادا کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ مذہبی جماعتیں سسٹم سے تعلق کی قیمت کب تک ادا کرتی رہیں گی؟ امریکہ کہتا ہے کہ چین میں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، ان کے حقوق پامال ہو رہے ہیں لیکن پاکستان، سعودی عرب اور دنیا کے 22 اسلامی ممالک نے بیان دیا کہ امریکہ کا بیان غلط ہے۔ چین میں مسلمانوں کے حقوق محفوظ ہیں، وہ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ سسٹم کی آواز تھی۔ چین نے پابندی لگائی کہ چین میں وہ تمام مساجد جو سعودی طرزِ تعمیر کی مطابقت میں بنائی گئی ہیں ان کو توڑ کر مقامی طرز تعمیر اختیار کیا جائے گا اس پر سعودی عرب بھی خاموش رہا۔ یہ سسٹم کی طاقت ہے۔ Global Economy کی طاقت Exchange Power کی طاقت صرف اور صرف قومی، معاشی، مالی، مادی مفادات کے سسٹم کی طاقت۔

TLP نے سسٹم سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ ’’فرانسیسی سفیر کو نکالو‘‘ صرف ایک نعرہ تھا، جو تحریک بن گیا۔ TLP نے رمضان میں اسلام آباد پہنچنے کا پروگرام دیا تو کئی کارکنوں کو پولیس نے روزے کی حالت میں گولیوں سے بھون دیا۔ گولیاں کام نہ کر سکیں اور احتجاج وسطی پنجاب تک پہنچ گیا تو سسٹم فوراً حرکت میں آیا۔ عمران خان سے پوچھے بغیر چیف آف آرمی سٹاف جنرل باجوہ نے عقیل کریم ڈھیڈی کے گھر پر مفتی منیب الرحمن کو طلب کیا خفیہ معاہدہ ہوا جو عمران خان کو بھی نہیں دکھایا گیا۔ معاہدے کی سرخی جنرل فیض حمید کا بیان تھا کہ جو کرنا ہے سسٹم کے اندر رہ کر کریں۔ TLP کو کہا گیا کہ سفیروں کو نکالنے کے مطالبے منظور نہیں، یہ سسٹم کے اندر کی آواز نہیں یہ پُرتشدد مظاہرے پُرتشدد دھرنے، راستے بند کرنا یہ سسٹم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے، اسے برداشت نہیں کیا جائے گا۔ سسٹم کے اندر رہ کر کام کریں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ TLP ایک جمہوری سیاسی پارٹی کے طور پر کام کرے، پُرتشدد مطالباتی سیاسی عمل کا حصہ نہ بنے۔ ایسے مطالبات نہ کرے جو سسٹم کے مفاد میں نہ ہوں۔ ایسے کام نہ کرے

جس سے امن متاثر ہو جلسے جلوس نکالنا آپ کا حق ہے مگر راستے بند نہ ہوں، لوگوں کو تکلیف نہ ہو، ٹریفک رواں دواں رہے۔ اسمبلیوں میں جائیں، وہاں آواز اٹھائیں۔ اس سے پہلے جماعت الدعوہ کو بھی یہی مشورہ سسٹم نے دیا کہ سیاسی جماعت بن جاؤ، قومی دھارے میں شامل ہو جاؤ، وہ فوراً ملی مسلم لیگ بن گئے۔ سسٹم نے انہیں سمو لیا۔ جمہوریت سیاسی پارٹی۔ جب سسٹم کے ساتھ چلتے ہیں تو سسٹم کی تابعداری کے سوا ان کے پاس کوئی راستہ نہیں رہتا۔ کیا سسٹم کو کمزور کیا جا سکتا ہے؟ کیا اسے بدلا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے باہر سے کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے؟ فوکو کا قول ہے کہ ایک ڈسکورس کو دوسرا ڈسکورس ہی بدل سکتا ہے۔ کیا اس کا اطلاق ہمارے سسٹم پر کیا جا سکتا ہے؟ مولانا فضل الرحمن نے یہ بھی کہا کہ سیاست اور پارلیمنٹ کے حمام میں سب ننگے ہیں (جنگ کراچی 16 فروری 2024ء) سوال یہ ہے کہ علماء اور مذہبی سیاسی جماعتیں ابھی تک اس حمام میں کر کیا رہی ہیں؟ وہ باہر نکل آئیں اور اپنا نیا لائحہ عمل طے کریں۔ صرف بیان بازی مسئلے کا حل نہیں ہے۔

سسٹم سے باہر رہ کر جدوجہد کریں

مولانا فضل الرحمن نے ایک اور بات بھی کہی۔ پاکستان میں کرسی پر بیٹھنے والا حکمران نہیں ہوتا (روزنامہ جنگ 16 فروری 2024ء) بات بالکل درست ہے۔ جمہوریت میں اصل حکمران جمہور یا ان کے نمائندے نہیں ریاست ہوتی ہے۔ اسی لیے کسی عوامی نمائندہ کے منتخب ہونے کے لیے کوئی خاص قابلیت، صلاحیت نہیں ہوتی کیونکہ ان کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔ جب مولانا پر یہ سچ ظاہر ہو چکا ہے تو تمام مذہبی سیاسی جماعتیں اس سیاسی دھارے سے باہر نکل کر متبادل کا سوچیں۔ جب حکمران حکمران نہیں ہے تو اپنی تمام قوت ایسی حکمرانی کے لیے کیوں منتشر کی جائے؟ ملک کا سسٹم عالمی سسٹم سے منسلک ہے لہذا وہاں سے جو کہا جاتا ہے پاکستان کا سسٹم صرف اسے مانتا نہیں اس پر عمل درامد بھی کرا دیتا ہے۔ اور سسٹم اتنا طاقتور ہے کہ وہ فتویٰ بھی بدل دیتا ہے مثلاً کرونا کا مسئلہ۔ WHO کے عالمی سسٹم نے کہا Social Distancing لازمی ہے تو پاکستانی ریاست نے بھی اعلان کر دیا کہ مساجد میں صرف پانچ لوگ جائیں گے۔ پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوں گے۔ جمعہ، تراویح، باجماعت نمازیں گھر پر پڑھیں گے۔ دوسرے معنوں میں سسٹم دین میں براہ راست مداخلت کر رہا تھا علماء کو

دین سکھا، بتا اور جتا رہا تھا۔ اس موقع پر مفتی تقی عثمانی صاحب اور مفتی منیب الرحمن صاحب نے پہلے مرحلے میں جرأت کا مظاہرہ کیا۔ کراچی پریس کلب میں پریس کانفرنس منعقد کی گئی۔ صحافیوں نے سوال کیا کہ کیا مساجد میں نمازیوں کے درمیان پانچ فٹ کا فاصلہ ہوگا، مائیک مفتی تقی عثمانی صاحب نے مفتی منیب صاحب کی طرف کیا۔ زوردار جواب آیا" ٹخنے سے ٹخنہ اور گھٹنے سے گھٹنا ملا کر نماز پڑھی جائے گی، تمام لوگ باجماعت نماز پڑھیں گے" لیکن دو دن کے بعد فتویٰ بدل گیا سسٹم نے فتویٰ تبدیل کر دیا۔ انہی مفتیانِ کرام نے اعلان کیا کہ لوگ جمعہ، تراویح، باجماعت نماز گھر پر پڑھیں۔ 50 سال سے اوپر والے مساجد نہ جائیں، سماجی فاصلہ پانچ فٹ برقرار رکھا جائے۔ اگر یہ محترم علماء اس موقع پر صرف خاموش رہتے یا ریاست سے صرف یہ کہہ دیتے کہ تم مساجد بند کر دو ہم تمہارے غیر شرعی احکامات کو نہیں مانتے۔ ہم نہ تمہارے سسٹم کو مانتے ہیں نہ WHO کے سسٹم کو۔ ہم قرآن وسنت کے سسٹم کو مانتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی ہمارا یہ عقیدہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے ہم کسی سماجی فاصلے کو نہیں مانتے۔ عہد صحابہ میں طاعون کی بیماری پھیلی لیکن مساجد بند نہیں ہوئیں، کسی طاعون والے کو مسجد آنے سے نہیں روکا گیا۔ سماجی فاصلہ نہیں رکھا گیا، مساجد میں باجماعت نماز ہوئی۔ وبا میں کیا کرنا ہے؟ اس پر اجماعِ صحابہ منعقد ہو چکا۔ اجماع صحابہ حجتِ قطعی ہے ہم ریاست کا، سسٹم کا، WHO کا فتوی نہیں مانتے ہم قران وسنت کے سسٹم کو مانتے ہیں۔ اور اس سسٹم کے فتوے کو مانتے ہیں علماء یہ کہہ دیتے تو ریاست خود بخود بے نقاب ہو جاتی کہ وہ کتنی اسلامی ہے! جس ملک، سلطنت، حکومت، ریاست، امارت میں عالم کے فتوے کو اہمیت، برتری، بالاتری حاصل نہیں ہے وہ اسلامی مملکت نہیں ہوسکتی اسلامی امارت کا مطلب صرف یہی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں شریعت کی بالادستی ہوگی اور اس کی ایجنسی علماء کے پاس ہوگی جس مملکت میں نفاذ شریعت کی ایجنسی علماء نہیں وہ جدید لبرل سیکولر ریاست ہے جس طرح پاکستان ہے۔ کرونا کے موقع پر علماء نے اپنا عقیدہ بیان نہیں کیا۔ یہ ان کی کمزوری تھی رمضان کا مہینہ تھا 21 رمضان آیا تو شیعہ علماء نے اعلان کیا کہ وہ سماجی فاصلے کو نہیں مانتے وہ ریاستی حکم کو بھی نہیں مانتے وہ، یوم علی کا جلوس نکالیں گے۔ جلوس بڑی شان سے نکالا گیا Social Distancing کے عالمی استعماری، قومی، مقامی، علاقائی قانون کو جلوس نے روند کر پھینک دیا تو سنی علماء کی غیرت جاگی۔ مفتی منیب الرحمن صاحب، مفتی تقی عثمانی صاحب کا

بیان آ گیا کہ کرونا کی وبا جاری ہے اور معلوم نہیں کب تک جاری رہے لہٰذا سماجی فاصلہ برقرار رکھنا کوئی ضروری نہیں۔ لوگ معمول کے مطابق نماز ادا کریں۔ ریاست کچھ نہیں کرسکی لیکن اس پورے عمل میں علماء کا ردعمل دیکھنے کے قابل ہے! ہم سسٹم سے کتنے متاثر اور خواہ مخواہ کتنے زیادہ خوفزدہ ہیں۔ وہ سسٹم جو ڈھائی فیصد شیعہ برادری کے سامنے ڈھیر ہو گیا وہ 98 فیصدی سنی برادری کے مقابلے پر کیسے کھڑا ہوتا؟ لیکن علماء پیچھے ہٹ گئے وہ ریاستی حکم کو چیلنج کرتے اور عوام سے کہتے کہ ریاست نے عملاً مسجدیں بند کرنے کا اعلان کیا ہے ہم اسے نہیں مانتے۔ عوام ہر جگہ علماء کی رہنمائی میں نماز باجماعت کا اہتمام کریں تو اس ریاست کا منحوس سیکولر چہرہ عوام کے سامنے آ جاتا جو خود کو اپنے مقاصد کے لیے اسلامی کہتی ہے لیکن جب عالمی دباؤ پڑتا ہے تو پاکستانی آئین دکھا کر کہتی ہے کہ ہم لبرل سیکولر ہیں۔ آرمی پبلک سکول پر TTP کے کارکنان کے حملے کے بعد مدارس بلا وجہ سب سے زیادہ دباؤ میں آئے تھے اور خود کو ریاست کا وفادار ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے کیونکہ ٹی ٹی پی میں شامل فدائی اصلاً مدرسوں سے فارغ طلبہ اور فاضلین تھے یعنی جہاد کی روح مدرسہ کی تعلیم نے ہی پھونکی تھی لہذا خوف کے مارے بہت سے مدرسوں نے اس سال پہلی مرتبہ مدرسوں کی سطح پر یوم پاکستان منایا، پہلی مرتبہ مدرسوں میں 14 اگست کو قومی پرچم کشائی کی تقریب ہوئی قومی ملی نغمات پڑھے گئے، کچھ مولویوں نے گلوکاروں کے طرز پر نے نوازی کی۔ یہ سسٹم کا خوف اور سسٹم کا جبر تھا حالانکہ کوئی ان سے پوچھ سکتا تھا کہ 70 سال تک آپ نے یہ کام نہیں کیا۔ آج آپ کو کیا ہو گیا؟ ریاست سے اپنی وفاداری ثابت کرنے کا برا وقت کیوں آ گیا؟ وہ دینی مدارس جو ہمیشہ پاکستان کو مدینہ ثانی کہتے رہے وہ TTP کی کاروائی سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ اپنی وفاداری کی مختلف اسناد بلا وجہ پیش کر رہے تھے۔

قومی سسٹم اور عالمی سسٹم جو ایک دوسرے سے منسلک ہیں اس کے جبر کی ایک اور مثال مولانا مودودی سے لیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی دو شکلیں ہیں (i) لبرل سرمایہ داری امریکہ و یورپ وغیرہ میں (ii) سوشلسٹ سرمایہ داری روس، چین وغیرہ میں۔ مولانا مودودی نے سوشلزم کا بہترین رد کیا لیکن سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتے ہوئے انہیں یہ اشتباہ لاحق ہوا کہ یہ تو اسلامی نظم معیشت سے قریب ہے۔ اس کی دلیل انہوں نے یہ دی کہ اسلام میں نجی ملکیت ہے اور سرمایہ درانہ نظام میں بھی نجی ملکیت ہے۔ حالانکہ یہ مولانا کی غلط فہمی تھی۔ لبرل سرمایہ

داری میں سرمایہ پر ریاست کی ملکیت تو نہیں ہوتی لیکن نجی ملکیت بھی باقی نہیں رہتی۔نجی ملکیت کی بجائے کارپوریٹ ملکیت جگہ لے لیتی ہے۔لوگ کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہیں معیشت صرف قرض پر چلتی ہے۔گاڑی، گھر، گھر کی اشیاء ہر چیز قرض سے آتی ہے کوئی مالک ہی نہیں ہوتا۔لہٰذا سوشلسٹ معیشت میں سرمایہ پر ریاست کی حکمرانی ہوتی ہے تو لبرل سرمایہ داری میں سرمایہ پر کارپوریشن کی حکمرانی ہوتی ہے، کسی کی نجی ملکیت باقی نہیں رہتی۔اس موضوع کی تفصیل کے لیے نائل فرگوسن کی مختصر کتاب *The Great Generation* بہت مفید رہے گی۔مولانا مودودی جیسے مفکر کو یہ بات کیوں نظر نہ آئی؟ یہ سسٹم کا جبر تھا۔سوشلسٹ نظام سرمایہ داری سے مقابلہ کرنے والے لبرل سرمایہ داری کے گروہ نے ایسا لٹریچر پیدا کیا جس میں یہی ثابت کیا گیا تھا کہ سرمایہ داری میں نجی ملکیت باقی رہتی ہے۔مولانا مودودی سسٹم کے اس جبر سے محفوظ نہ رہ سکے۔علماء کو اور اسلامی تحریکوں، مذہبی جماعتوں کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ عمران خان کو فوجی اشرافیہ نے کیوں پال پوس کر جوان کیا؟ عمران خان پر 1989ء سے کام ہو رہا تھا 1989ء میں پہلی مرتبہ پاکستان کے تمام اخبارات میں ایک ہی دن ادارتی صفحے پر عمران خان کا کالم شائع ہوا۔یہ کالم عمران خان کی آمد کا اعلان تھا عمران خان نے سب سے زیادہ نقصان مذہبی جماعتوں کو پہنچایا۔صوبہ سرحد MMA یعنی مذہبی جماعتوں کا گڑھ تھا، اسے عمران خان کے سپرد کر دیا گیا۔یہ خطہ جو شروع سے مذہبی اور استعمار دشمن ہے اب مذہبی جماعتوں کے ہاتھ سے نکل کر عمران خان کے ہاتھ میں ہے۔وہ عمران جو امریکہ کا سب سے بڑا حامی ہے، اب امریکہ کا نام نہاد دشمن ہے۔اس کی زبان پر ریاست مدینہ کا نام ہے۔اس کی بیوی کے جسم پر برقعہ ہے، اس کے ہاتھ میں تسبیح ہے، اس کی زبان پر ’اياك نعبد و اياك نستعين‘ ہے اس نے پاکستانی فوج کو پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ گالیاں دیں اور پختون اپنے ملک میں فوج کے ہاتھوں اپنی ہجرت سے ویسے ہی بہت نالاں تھے۔اب وہ جیل میں بھی بند ہے، اس کی پارٹی نے کسی انتخابی مہم کے بغیر بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کی ہے۔عمران نے فوج کو بھی نقصان پہنچایا ہے لیکن صوبہ سرحد میں سب سے زیادہ نقصان اسلامی قوتوں کو پہنچا ہے اور مستقبل میں پہنچتا رہے گا۔قیادت علماء کے ہاتھ سے نکل کر ایک لبرل سیکولر عمران کے ہاتھ میں آ گئی کیا پاکستان ایک استعماری کالونیل ریاست نہیں ہے؟ کیا یہ امریکہ، برطانیہ کی شروع سے آلہ کار نہیں ہے؟